www.urducouncil.nic.in

قیمت : -/10 ₹

National Council for Promotion of Urdu Language

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

# خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جنوری 2021

# ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

## قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
# بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

**ان کے علاوہ:**

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

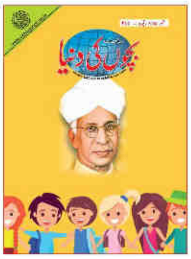

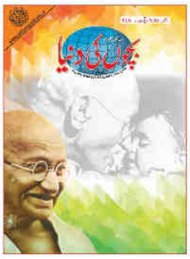


**سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ**

قیمت فی شمارہ:10 روپے    سالانہ:100 روپے

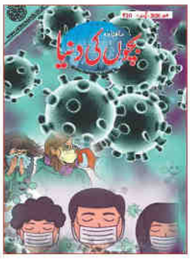

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون:040 - 24415194

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ
# خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد: 5 شمارہ: 1 جنوری 2021

**مدیر اعلیٰ** : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

**مدیر منتظم** : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

**مشیر** : ڈاکٹر مسرت

## ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اوراس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

## صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

## شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

# اس شمارے میں


| | | | |
|---|---|---|---|
| اداریہ | مشعل | مدیر | 4 |
| روبرو | عذرا نقوی سے مکالمہ | ڈاکٹر نشاں زیدی | 5 |
| شخصیت | قومی پرچم ترنگا کی ڈیزائنر: ثریا طیب جی | سعدیہ اقبال | 10 |
| نکہت سخن | شاعرات کے منتخب اشعار | | 13 |
| جہان نسواں | عائشہ عودہ کی خودنوشت اُحلام بالحریۃ | ڈاکٹر صہیب عالم | 14 |
| | علامہ اقبال کی شاعری میں خواتین کا تصور | ڈاکٹر محمد محسن | 18 |
| | تانیثیت اور خواتین ناول نگار | محمد یونس ٹھوکر | 21 |
| | کرشن چندر کے ناول 'شکست' کا تجزیاتی مطالعہ | بلقیس امین | 26 |
| | مسائل نسواں کا عکاس: مراۃ العروس | سید محمد ظفر اقبال | 30 |
| | این سی ای آر ٹی کے نصاب میں شامل افسانے | مہرین قادر حسین علی جان | 33 |
| شناخت | ارض محبت کی سفیر: نگار بانو ناز | ڈاکٹر سرفراز جاوید | 37 |
| | رخشندہ روحی کی خوشبو کہانیاں | ڈاکٹر شہاب افسر خان | 42 |
| کہانیاں | نکاح کے دو بول | خیر النساء علیم | 45 |
| | نصیب | نزہت نبیلہ | 50 |
| حسن سخن | ڈاکٹر عائشہ سمن، ڈاکٹر جوہی بیگم شاما | | 53 |
| باورچی خانہ | لذیذ پکوان | | 55 |
| صحت | عسر طمث | ڈاکٹر احسان رؤف | 57 |
| آرائش و زیبائش | حسن کی نگہداشت | | 60 |
| تاثرات | تاثرات نگر نگر سے | | 62 |

# مشعل

نیا سال اور یوم جمہوریہ قارئین خواتین دنیا کو مبارک!

دنیا کے کسی بھی ادب کی تاریخ خواتین کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ تخلیق کے میدان میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ عالمی ادبیات پر اگر نظر ڈالی جائے تو ایسی بہت سی خواتین نظر آتی ہیں جنھوں نے علم وادب کے میدان میں گراں مایہ خدمات انجام دیں اور زبان کو معیار بخشا۔ طبقۂ نسواں میں ایسی بہت سی شخصیتیں ہیں جنھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور اردو زبان کو اپنی گراں قدر خدمات سے مالامال کیا۔

ہر عہد میں خواتین نے تخلیق سے اپنا رشتہ جوڑا ہے اور اپنے جذبات واحساسات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیسویں صدی میں ایسی بہت سی خواتین گزری ہیں جنھوں نے مختلف اصناف میں اپنی موجودگی درج کرائی ہے۔ افسانہ، شاعری، ناول، سفرنامہ غرض ادب کا ایسا کون سا شعبہ ہے جس میں انھوں نے اپنی ادبی لیاقت اور تخلیقی قوتوں کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ بہت سے ایسے نام ہیں جنھوں نے اپنے ادبی جوہر سے معاشرے کو ایک نیا زاویہ عطا کیا۔

خواتین کی ادبی تخلیق کا سلسلہ قدیم ہے۔ کچھ اصناف تو خواتین سے ہی منسوب سمجھی جاتی ہیں۔ اردو ادب میں بھی قدیم عہد سے ہی شاعرات اور نثر نگار خواتین کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ زیب النساء، مہ لقا چندا، لطف النساء امتیاز یہ وہ نام ہیں جن کا ذکر کیے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ تنقید کے میدان میں بھی خواتین بہت فعال رہی ہیں۔ ممتاز شیریں کا نام اس ضمن میں اہمیت کا حامل ہے۔ بعد کی نسل میں بھی خواتین تنقید نگاروں کی ایک بڑی تعداد ہے جو ممتاز شیریں کی تنقیدی روایت کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ تحقیق کے میدان میں بھی خواتین نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ صالحہ عابد حسین، رفیعہ سلطانہ، صغریٰ مہدی، شمیم نکہت، قیصر جہاں اور ان کے علاوہ بھی بہت سے نام ہیں جنھوں نے تحقیق کے میدان میں اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ سیدہ جعفر تحقیق کا نہایت معتبر نام ہے۔ سفرنامہ اور خودنوشتوں کے ذریعے بھی خواتین نے اپنے داخلی وجود کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ شہر بانو بیگم، سعیدہ بانو، عصمت چغتائی، کشور ناہید، ادا جعفری نے ایسی آپ بیتیاں لکھی ہیں جن میں ہر عہد کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ طنز ومزاح کے میدان میں بھی خواتین کی ایک بڑی تعداد رہی ہے۔ ڈاکٹر لئیق صلاح، ڈاکٹر حبیب ضیا، شفیقہ فرحت، رفیعہ منظور الامین، شمیم علیم اور فرزانہ فرح نے طنز ومزاح کے میدان میں اپنی ظرافت کے جوہر دکھائے ہیں۔ سیاست اور صحافت کے میدان میں بھی خواتین سرگرم عمل رہی ہیں۔ نور جہاں ثروت صحافت کے حوالے سے اہم نام ہے۔ افسانوی نثر ہو یا شاعری غرض ہر میدان میں خواتین اپنی ذہانت اور لیاقت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ شاعری کے باب میں تو لاتعداد ایسے نام ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین شاکر، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، رفیعہ شبنم عابدی، شہناز نبی، عذرا پروین وغیرہ معاصر شاعری میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کی دوررس نگاہیں صرف نسائی مسائل کی ہی عکاسی نہیں کرتیں بلکہ عالمی مسائل پر بھی وہ گہری نگاہ رکھتی ہیں۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر نشاں زیدی

# عذرا نقوی سے مکالمہ

## تعارف

نام: عذرا نقوی، والد کا نام: قیصر نقوی، والدہ: سیدہ فرحت (دوراول کی شاعرہ)
شوہر: پروفیسر پرویز احمد
ادبی میدان: شاعری، تحقیق، افسانہ نگاری، ترجمہ نگاری
تعلیم: ایم۔ایس۔سی، (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، ایم فل (جواہر لعل نہرو یونیورسٹی) ڈپلومہ ان اسپیشل ایجوکیشن (منٹریال کناڈا)
تدریسی تجربہ: کناڈا، سعودی عرب اور ہندوستان میں کئی تعلیمی اداروں سے وابستہ رہیں۔
سماجی خدمات: مانٹریال میں برصغیر کی مہاجر خواتین کی مدد کے لیے ''ساؤتھ ایشیا کمیونیٹی سینٹر'' کی بنیاد ڈالی، مانٹریال میں تھیٹر گروپ ''تیسری دنیا'' میں بھی خدمات انجام دیں۔
صحافتی تجربہ: ''مانٹریال سرائے'' اور ''نیوز اینڈ ویوز'' کی ادارتی ٹیم میں شامل رہیں اور انگریزی اخبار ''سعودی گزٹ'' میں آزاد صحافی کے طور پر خدمات انجام دیں۔
تصنیفات: سعودی عرب کی قلم کار خواتین کی منتخب کہانیاں (ترجمہ 2008)، میرے شب و روز، سعودی عرب کے مشہور صحافی احمد السباعی کی خودنوشت (ترجمہ 2011)، دل کے موسم (شعری مجموعہ 2011)، آنگن جب پردیس ہوا (افسانوی مجموعہ 2013)، جہاں بنالیں اپنا نشیمن (مضامین 2013)، شعر، کتابیں یادیں (مضامین اور تبصرے 2019)، کلیات سیدہ فرحت (مرتب 2016)
انعامات واعزازات: دختر اردو ایوارڈ (ہم ہندوستانی تنظیم سعودی عرب کی جانب سے)، ایوارڈ برائے ادبی خدمات (جامعہ ملیہ اسلامیہ المنائی ایسوسی ایشن سعودی عرب کی جانب سے) ایوارڈ برائے ادبی خدمات (حسن آرا ٹرسٹ کی جانب سے)

**س:** بچپن زندگی کا سب سے حسین دور ہوتا ہے۔ ہر انسان کے دل میں کہیں نہ کہیں خواہش ہوتی ہے کہ کاش بچپن ایک بار لوٹ آئے۔ میم آپ اپنے بچپن کے بارے میں کچھ بتائیں کہ کس طرح گزرا اور کہاں گزرا؟

**ج:** میرا بچپن بہت اچھا گزرا۔ اب تک میں اپنے بچپن میں ہی جی رہی ہوں۔ میرے ذہن میں دھندھلی دھندھلی یادیں ہیں۔ میں جامعہ ملیہ کے نرسری اسکول میں پڑھی۔ اور میرا ننھیال تھا ڈاکٹر عابد حسین کے یہاں اور ہمارے والد بھی جامعہ سے جڑے ہوئے تھے۔ 1957 سے پہلے میں جامعہ اور دلی میں رہی پرانی دلی میں، تو وہاں کی یادیں بے تحاشہ ہیں جامعہ میں میرا بچپن گزرا۔ اس کے بعد ہمارے والد علی گڑھ چلے گئے ۔ وہ سوشل ایجوکیشن افسر تھے۔ انھوں نے ''بال برادری'' نام کی ایک تنظیم قائم کی ۔ جس کے تحت سارے علی گڑھ شہر میں بچوں کے لیے کلب قائم کئے گئے تھے، جس میں بچوں کے لیے شام کے وقت غیر نصابی دلچسپ، تفریحی اور علمی مشاغل مہیا کیے جاتے تھے۔ شہر کے سارے کلبوں کے درمیان کرکٹ ٹورنامنٹ ہوتے تھے، کلچر پروگرام ہوتے تھے، تقریری مقابلے ہوتے تھے۔ ایک ایسا انسٹی ٹیوشن تھا جواب کہیں ملتا نہیں ہے۔ تو تم اندازہ کرسکتی ہو کہ جہاں بچوں کے لیے اتنی سرگرمیاں ہوں، ظاہر ہے بچپن کیسا گزرا ہوگا اور پھر ہمارا ادبی گھرانا تھا ہم نے بچپن سے دیکھا کہ نانی نے یہ ناول لکھا، ان کا یہ ناول چھپا۔ ہماری امی

شاعرہ تھیں اور وہ بچپن سے ہی ہمیں جو لوریاں سناتی تھیں وہ ادب سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔ مطلب اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں گنگنا رہی ہیں۔ ہماری امی ترقی پسند مصنفین کی ممبر بھی تھیں جامعہ کی۔ ہمارا بچپن تو ایک طلسم تھا وہ دور ہی کچھ ایسا تھا۔ بہت ہی خوبصورت دور میں ہمارا بچپن گزرا ہے۔

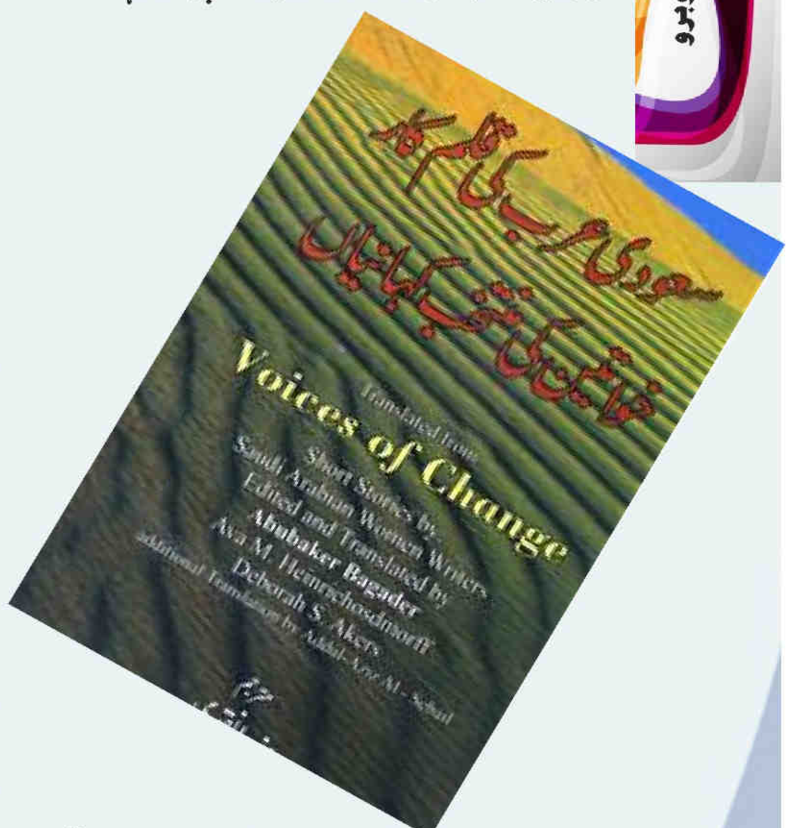


**س**: آپ نے لکھنے کی ابتداء کب اور کیسے کی اور آپ کی پہلی تخلیق کون سی ہے۔ اس کو کس طرح کی پذیرائی ملی۔

**ج**: ہمارے یہاں تو بچپن سے ادبی ماحول تھا امی شاعری کر رہی ہیں۔ میری والدہ سیدہ فرحت ایک بہت اچھی شاعرہ تھیں۔ لکھنے پڑھنے کا میرا شوق میری امی ہی کی دین ہے۔ بچپن سے میں نے ان کے ہاتھ میں باورچی خانے کی کفگیر کے ساتھ ساتھ کتاب بھی دیکھی اور روٹی پکاتے ہوئے اشعار گنگناتے سنا۔۔ میری ادبی زندگی کا آغاز اس دن سے ہوا جب میری امی نے اپنی تصنیف کردہ لوریاں اور گیت سنا کر مجھے تھپکی دے کر سلایا۔ جب اور بڑی ہوئی تو میرے دادا غلام احمد صاحب نے اپنے دلنشیں ڈرامائی انداز میں پرانے قصے کہانیاں، پہیلیاں اور کہ مکرنیاں سنائیں۔ اپنے دادا سے ہی میں نے اردو پڑھنا لکھنا سیکھی۔ ہمارے ابا جان نے بچوں کی کتابوں کی ایک چھوٹی سی لائبریری میری گڑیوں کے گھروندے کے ساتھ بنائی تھی، انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے ننھی منی کتابوں کی جلد باندھی تھی اور ہر کتاب پر باقاعدہ نمبر ڈالے تھے۔ اپنے ننیہال میں ڈاکٹر عابد حسین اور صالحہ عابد حسین کی مثال میرے سامنے تھی، جن کی زندگی ہی علم وادب سے عبارت تھی۔ ہمارے چچا غزلیں پڑھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے وہ بحریں، مرثیے، نوحے سنے۔ تک بندی تو ہم نے سات آٹھ سال کی عمر میں کر لی ہوگی۔ جیسے محرم کر کے آئے کہا ''حضرت امام حسین کے گھوڑے کو بلا دو۔ جس شخص کو پانی نہ ملا اس کو پلا دو''۔ یہ سمجھو میرا چھ سال کی عمر کا پہلا شعر ہے، میری پھوپی بتاتی ہیں۔ اس کے بعد مضامین اسکول میں لکھتے رہتے تھے کیونکہ اردو اچھی تھی۔ لیکن میں نے باقاعدہ کہانی ساتویں کلاس میں لکھی تھی۔ اس میں میں نے لکھا تھا ''ایک لڑکا ہے اس کی آواز آرہی ہے اور وہ قریب آتا جا رہا ہے اور میرا دل تڑپ رہا ہے کیسے ظالم گھر والے ہیں کہ مجھے جانے نہیں دے رہے ہیں اس کے بعد میں نے یہ کھولا کہ وہ آئس کریم والا تھا جو بیچ رہا تھا۔

**س**: آپ کی والدہ سیدہ فرحت ایک اچھی شاعرہ تھیں بلکہ دور اول کی خواتین شاعرات میں نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں کچھ بتائیے؟

**ج**: جامعہ میں جب ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنی ہماری امی اس کے اندر برقع پہن کر جاتی تھیں۔ ہماری امی کی کوئی باضابطہ تعلیم نہیں ہوئی۔ بس تھوڑے دن بھوپال میں اسکول میں پڑھا تھا، بعد میں اپنے ماموں عابد صاحب کے یہاں پڑھائی کی۔ لیکن اتنی قابل تھیں کہ ایم اے کے طلبا کو اردو پڑھاتی تھیں۔ ہماری والدہ 14 سال کی عمر سے ہی شاعری کرتی تھیں۔ ابھی میں نے ان کی کلیات مرتب کی ہے۔ چونکہ وہ عابد صاحب اور صالحہ عابد حسین کے زیر اثر رہیں تو ادبی ماحول کا اثر پڑا۔ وہ فطری شاعرہ تھیں انھوں نے نوحے بھی لکھے اور کچھ انقلابی قسم کی نظمیں لکھیں۔ ان کی پہلی کتاب میں جو 1960 میں شائع ہوئی تھی ''بزم خیال'' اس میں اس طرح کی نظمیں تھیں جن سے ان کے ترقی پسند خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ بعد میں صوفیانہ قسم کی شاعری بھی کی جو ان کی کتاب ''نوائے حیات'' میں ہے۔ وہ فطری طور پر صوفیانہ مزاج کی تھیں۔ ان کو دنیا داری زیادہ نہیں آتی تھی وہ ریڈیوں میں مشاعروں میں بھی پڑھتی تھیں، لیکن بالکل سادگی سے اور وہ خدمت خلق بہت کرتی تھیں۔ انھوں نے غریب بچوں کے لیے اسکول کھولا تھا اور اس میں مفت پڑھاتی تھیں۔ بعد میں چونی فیس لی تاکہ ان کو کچھ کھلا سکیں اور ہماری جو ''بال برادری'' تھی ہم ان سے لکھواتے تھے کہ اس دھن پر قوالی لکھ دیں یا نظم لکھ دیں وہ لکھ بھی دیا کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے ہماری امی اکثر یہ لوری سناتی تھیں۔

سوجالال میرے تیرے لیے جاگے سارا جہان تیرے لیے
جاگے تیرے لیے فوج امن کی جاگے مجور جاگے کسان

**س**: آپ کی ننھیال اور ددھیال میں ادبی ماحول رہا۔آپ بہت خوش قسمت ہیں۔آپ کے یہاں کس طرح کی محفلیں جمتی تھیں اور کس طرح کا ادب لکھا جارہا تھا۔

**ج**: زندگی نے مجھے اتنا کچھ دیا ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھلتا۔خاندانی اور سماجی ورثے میں مجھے جو اعلیٰ اخلاقی ،سماجی اور ادبی اقدار ملی ہیں،ان پر مجھے ناز ہے میرے والد ایک روشن ضمیر، باعمل انسان تھے۔ان سے میں نے اعلیٰ اخلاق اقدار اور انسان دوستی کی قیمتی جاگیر ورثے میں پائی۔ ہمارے ابا کی ایک رشتہ کی بہن ہیں ان کی ابھی کتاب بھی چھپی ہے قصیدے اور منقبت کی۔امروہہ میں ایک رواج ہے شاعری کا۔شادی میں گیت بھی گاتی۔ہماری جو پھوپھی تھیں کنیز سیدہ نام تھا ان کا۔ان کے سلام منقبت اور قصیدے، بہت اچھے ہیں۔یہ وہ عورتیں تھیں جن کی تشہیر نہیں ہوتی تھی لیکن بہت اچھی شاعرات تھیں۔امی نے ایک’’ بزم ادب‘‘ بنائی تھی1962 میں علی گڑھ میں جو آج تک قائم ہے۔وہ خواتین جو گھر میں رہتی ہیں ہر مہینے ایک نشست کرتی تھیں اور سب عورتیں لکھ کر لاتی تھیں۔ اس میں نعیمہ جعفری پاشا بھی آتی تھیں میں بھی جاتی تھی۔ہم چھوٹے چھوٹے تھے۔وہ بزم ادب آج بھی چل رہی ہے، ہما خلیل چلا رہی ہیں۔ گھر میں اس طرح کا ماحول تھا کہ بیت بازی ہورہی ہے، یا کسی ایک لفظ پر بحث ہورہی ہے۔واقعی میں نے ایسے ماحول میں پرورش پائی جہاں ادب رچا بسا تھا۔

**س**:آپ کی خالہ صغرا مہدی ایک اچھی فکشن نگار تھیں۔ان کی نگارشات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

**ج**:ان کی نگارشات بہت اچھی ہیں سادی ہیں۔سادگی کے ساتھ روانی ہوتی ہے۔بعد میں انھوں نے لکھا تھا’’بے قطر کو دپڑا‘‘ مزاحیہ وہ مجھے بہت پسند ہے ان کے ناول بہت اچھے ہیں ان میں ایک حقیقت ہے اور سادگی ہے۔ان کی خودنوشت بھی بہت اچھی ہے۔وہ خام خواہ اپنی قابلیت بگھارنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں۔وہ اپنی بات سادگی سے کہتی تھیں بہت محنت کی ہے انھوں نے ، ، بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

**س**:آپ شاعرہ بھی ہیں افسانے بھی لکھتی ہیں۔آپ نے اپنی پھوپی اور خالہ سے کتنا اثر قبول کیا یا اپنی الگ راہ نکالی۔

**ج**:دیکھو لاشعوری طور پر تو اثر قبول کیا ہے۔میں نے اردو ادب کا بہت مطالعہ کیا ہے۔لاشعوری طور پر میں متاثر تھی لیکن۔جن کی طرح میں لکھنا چاہتی تھی وہ تھیں قرۃ العین حیدر میں ان کی بہت بڑی مداح ہوں میں نے ان کی تخلیقات پڑھی ہیں۔اصل معنی میں وہ ہیں میری آئیڈیل۔

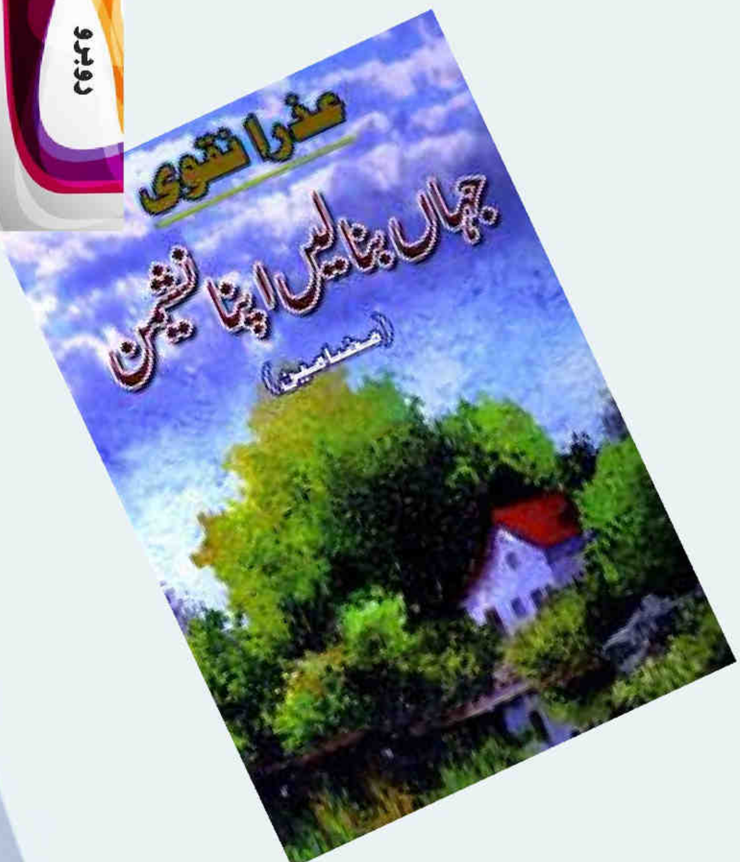


**س**:آپ کے گھر کا ادبی ماحول رہا۔اور آپ کو قدرت کی طرف سے تخلیقی ذہن ودیعت ہوا۔شادی کے بعد آپ کو کوئی دقت تو نہیں آئی۔ آپ کے شوہر کا رویہ کیسا تھا۔

**ج**: میں اپنے آپ کو بہت زیادہ خوش قسمت سمجھتی ہوں میرے شوہر میری جان پہچان کے تھے میری پسند کی شادی تھی۔وہ اتنا خوش ہوتے تھے میرے لکھنے سے۔میں نے ترجمے بھی کیے۔میں سعودی عرب گئی میں نے ملازمت کی انھوں نے کہا بھئی تم وقت برباد مت کرو چھوٹی موٹی نوکری کرکے،تم لکھا کرو۔میرے شوہر فخر کرتے تھے جب میں مشاعرے میں پڑھتی تھی یا کچھ لکھتی تھی بلکہ میں نے بہت دن تک افسانہ نہیں لکھا تو بولے میں دیکھ رہا ہوں تمہارا کوئی نیا افسانہ نہیں آیا، میں نے کہا وہ میں ترجمے میں مصروف تھی۔بولے جی نہیں ترجمہ سے کچھ نہیں ہوتا ٹی وی شو دیکھ رہی ہو میں دیکھ رہا ہوں تم کو۔انھوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔میں نہیں سمجھتی کہ تمام شوہر ایسا کرتے ہوں گے۔وہ واقعی خوش ہوا

کرتے تھے۔ان کا انتقال 2013 میں ہوا ہے۔انھوں نے ہی مجھ سے کہا کہ اپنی امی کی کلیات مرتب کرو۔وہ خود بھی شاعری کرتے تھے۔وہ میرے پہلے قاری تھے۔

**س**: آپ اپنے اساتذہ کے بارے میں کچھ بتائیں۔جن کے بغیر آپ کی نگارشات کو وہ شکل نہیں مل پاتی جو آپ کا طرہ امتیاز ہے۔

**ج**: اردو تو میں نے کبھی سبجیکٹ کے طور پر پڑھی ہی نہیں اردو میڈیم اسکول میں علی گڑھ میں ہم پڑھے تھے۔لیکن سائنس کی طالبہ رہی میں۔ ہمیشہ میرا تعلق اردو سے رہا اور اردو والوں کے میں دو نام لینا چاہوں گی شاعری کے حوالے سے۔ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی یہ ہماری دور کی رشتہ دار بھی لگتی تھیں میں ان کو اپنی نظمیں سناتی تھی۔وہ جو دل میں آتا تھا کہہ دیتی تھیں ہاں شمع...... شمع میرا گھر کا نام ہے بھئی یہ زیادہ اچھی نہیں ہے اور اگر کوئی نظم اچھی ہوتی تو کہتی ارے واہ۔ان لوگوں کے پاس بیٹھ کر میں نے کافی سیکھا۔ زبان میں نے والدہ سے سیکھی کیونکہ ہماری امی اتنی فصیح زبان بولتی تھیں اگر ہم کوئی غلط لفظ بولتے تو فوراً ٹوکتی کیا یہ گانٹھ لگا دی۔ تو زبان میں نے امی سے سیکھی اور شاعری کے بارے میں ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی سے کافی کچھ سیکھا۔ بلکہ زاہدہ زیدی تو میرے افسانوں کی بھی تعریف کرتی تھیں۔

**س**: آپ کا کوئی افسانوی مجموعہ آیا ہے، اس میں کس طرح کے افسانے ہیں۔

**ج**: ہاں آیا ہے۔''آنگن جب پردیس ہوا''۔میں 38 سال باہر رہی ۔ابھی 2010 میں واپس آئی ہوں۔تو جو وہاں کے میرے تجربات تھے۔میں شادی کے بعد دو سال عراق میں رہی۔پھر کناڈا میں رہی۔ میرے افسانوں میں ہجرت کا موضوع بہت حد تک چھایا ہوا ہے۔ہجرت نے انسانی ارتقاء کے ہر دور میں نئے منظرنامے لکھے ہیں۔ہجرت کے ساتھ منسلک، جغرافیائی، معاشی اور سماجی تبدیلیاں انسان کی شخصیت کی نئی پرت کھولتی ہیں، نئے امکانات اور تضادات سامنے لاتی ہیں تو وہاں کے لوگوں کے مسائل زیادہ ہیں کچھ ان میں ہندوستان کے بھی ہیں۔میری زیادہ تر کہانیوں کے کردار نسوانی ہیں یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیونکہ عورت ہونے کے ناطے میں ان کرداروں کو بہ آسانی سمجھ سکتی ہوں ہر نسوانی کردار میرا اپنا بن جاتا ہے۔رومانیت میرے افسانوں میں نہیں ملے گی۔ میری شاعری میں بھی رومانیت نہیں ہے۔کیونکہ ''بال برادری'' کی وجہ سے گھر میں سوشل سرگرمی ہوتی تھی۔ہمارے ابا سوشل ورکر تھے۔ہمارے والد قیصر نقوی ایک فعال آدمی تھے۔انیس قدوائی اور سبھدرا جوشی کے ساتھ انھوں نے 1947 کے بعد بہت کام کیا ہے۔تو ان کا وہ بیک گراؤنڈ ''بال برادری'' شہر کے لوگوں میں مفاہمت پیدا کرنا، قومی یک جہتی تو یہ سب میرے اندر رہے ۔ادب اور سماجی خدمت میرے اندر ہے اور یہی سرچشمہ ہے میرے لکھنے کا۔اس کے علاوہ سعودی عرب کے اخباروں میں میں کالم لکھتی تھی ۔میرا ہر ہفتہ کالم آتا تھا۔میرا جو دل چاہا وہ لکھا۔ادب میرا شوق ہے۔میرا پیشہ نہیں ہے ۔نا مجھ میں کبھی خود کو ظاہر کرنے کی خواہش ہوئی۔میں بے نیاز ہوں جو دل چاہا لکھا۔کوئی واقعہ مجھے متاثر کرتا ہے تو میں لکھتی ہوں۔کبھی وہ کہانی کی شکل میں ہوتا ہے کبھی نظم کے پیرائے میں ڈھل جاتا ہے ویسے میں نظمیں زیادہ کہتی ہوں۔شاعری ہو یا افسانہ اگر آپ کی واردات قلب نہیں اگر آپ نے محسوس کر کے نہیں لکھا ہے اپنے اندر جذب نہیں کیا ہے تو میرے نزدیک وہ اچھی تخلیق نہیں ہو سکتی۔

**س**: آپ شاعری بھی کرتی ہیں۔مشاعروں میں بھی جاتی ہیں۔ کچھ مشاعروں کے بارے میں بتائیں۔

**ج**: اے بھیا جب سے مشاعرے تجارتی ہوئے ہیں تو شاعری تو ایک طرف ہو گئی ہے۔کارکردگی پر زیادہ دھیان ہے۔کون کتنی اچھی لگ رہی ہے، کون ترنم میں غزل پڑھ رہی ہے۔بس شاعری ایک کارکردگی ہو کر رہ گئی اور خواتین نے پتہ نہیں کس رنگ میں ڈھال لیا ہے۔بعض وقت تو شرمندگی سی ہونے لگتی ہے بہر حال میں کسی کو الزام نہیں دے رہی۔یہ صارفی سماج ہے اور صارفی سماج میں ہر آدمی اپنا ہنر بیچ رہا ہے۔اب جو مطالبہ ہوگا جس میں آپ کو فائدہ ہے، آپ وہ کرتے ہیں۔میں صرف شاعرات کو نہیں کہہ رہی ہوں میں شاعروں کو بھی کہہ رہی ہوں۔مشاعروں کی تو نوعیت ہی بدل گئی ہے۔ادبی محفلیں ہوتی ہیں اس میں مجھے مزا آتا ہے۔

**س**: ادب میں کس شاعر یا ادیب کو پسند کرتی ہیں اور کیوں؟

**ج**: مجھے نثر میں تو سب سے زیادہ قرۃ العین حیدر پسند ہیں اور شاعری میں ہمارا وہ دور تھا ساحر، فیض، سردار جعفری سبھی بہت پسند ہیں۔پوری پوری نظمیں یاد تھیں ہمیں۔ سردار جعفری کی نظمیں پڑھتے تھے۔اب میں جو ریختہ میں کام کر رہی ہوں میں اب اساتذہ کو پڑھ رہی ہوں۔غالب کی غزلیں تو سنتے ہی رہتے تھے نا۔میر انیس سے واقف تھی مجلسوں کی وجہ سے میر انیس کے مرثیوں کے بھی پورے پورے بند یاد تھے۔اب بس سمجھو میں بہت زیادہ پڑھتی ہوں۔مجھے اب موقع مل رہا ہے اور کتابیں بھی موجود ہیں تو اب پتہ یہ چلتا ہے کہ ہم نے کچھ نہیں پڑھا ہے۔کتابوں کو پڑھو کتنا کتنا لوگوں نے کام کیا ہے۔

**س**: آپ نے بیرون ممالک کا سفر بھی کیا ہے بلکہ کئی سال رہی بھی

ہیں۔ برصغیر ہندوپاک اور ان ممالک میں اردو کی صورتحال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

ج: پاکستان میں میں مشاعرے میں گئی ہوں اور میرے رشتہ دار بھی بہت ہیں۔ اصل میں اب تو انٹرنیٹ سے ہندوستان اور پاکستان کا فرق مٹ گیا ہے۔ ہمارے اتنے گروپ ہیں خواتین کے ہم لوگ ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہیں اپنی چیزیں۔ پاکستان کی شاعرات ہیں میں ان کی چیزیں دیکھتی ہوں۔ اب تو سرحدوں سے کوئی مطلب ہی نہیں رہا ادب کے حوالے سے۔ کہنا چاہوں گی اتنی اتنی اچھی شاعرات ہیں اور ہر طرف ہیں آپ کس طرح کے لوگوں سے کمیونیکیٹ کرنا چاہتی ہیں۔ اب سارا ادب آسانی سے مل جاتا ہے۔ پاکستان کے افسانے وغیرہ سب ویب سائٹ پر ہی پڑھ لیتے ہیں بیرونی ممالک میں بہت اچھا لکھا جا رہا ہے وہاں کی شاعرات بہت اچھی شاعری کر رہی ہیں۔ ہمارے یہاں بھی کچھ بہت اچھی شاعرات ہیں پرانی اور نئی بھی۔

س: معاصر ادیبوں میں آپ کو کون پسند ہے۔ آپ معاصر ادب سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: میں ذکیہ مشہدی صاحبہ سے بہت متاثر ہوں وہ واقعی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ کیا لکھتی ہیں میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ وہ عورتوں میں سب سے اچھا لکھتی ہیں اردو فکشن میں مجھے سب سے اچھی وہ لگتی ہیں۔ انھوں نے ابھی کوئی ناول نہیں لکھا ایک ناول لکھ رہی ہیں وہ مکمل ہونے والا ہے۔ ان کے جو سماجی سروکار ہیں اور جو انداز اسلوب ہے وہ ایسا ہے جو اپنے حصار میں لے لیتا ہے آپ جب پڑھنا شروع کریں تو چھوڑ نہیں سکتے۔ اور بھی لکھنے والیاں ہیں لیکن مجھے آج کل سب سے زیادہ ذکیہ مشہدی پسند ہیں۔ نعیمہ جعفری بہت اچھا لکھ رہی ہیں وہ مضامین بھی بہت اچھے لکھتی ہیں۔ ان کی کہانیاں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں اور انھوں نے جو نظیر پر کتاب لکھی وہ بہت معیاری کتاب ہے۔ اپنے ہمعصروں میں نعیمہ جعفری بہت پسند ہیں۔ شاعروں میں تو بہت زیادہ ہیں۔ شاعری کا تو بول بالا ہے۔ بہت زیادہ شاعری ہو رہی۔ لیکن مجھے تو عرفان صدیقی کی غزلیں بہت پسند ہیں عرفان ستار کی غزلیں بھی بہت پسند ہیں۔ نظموں کے شاعر کم ہیں اختر الایمان وغیرہ کی نظموں کے ساتھ ہم بڑے ہوئے ہیں ہمارے اوپر ان کا اثر ہے۔

س: آپ بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم یعنی بنات سے وابستہ ہیں۔ آپ بنات کی وائس پریزیڈنٹ ہیں۔ بنات کے بارے میں کچھ بتائیے۔ اس سے نئی لکھنے والی خواتین کس طرح مستفید ہو رہی ہیں۔

ج: دیکھو ہمارے ساتھ ہماری سرپرست ہیں، جیسے ذکیہ مشہدی ہیں، قمر جمالی ہیں، بلقیس آپا ہیں، رفیعہ شبنم عابدی ہیں اور ہم لوگ بھی اچھے خاصے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ تو ہم لوگ ایسا کرتے ہیں کہ نئی لکھنے والی لڑکیوں کی تربیت ہو سکے۔ ہم لوگ چاہتے ہیں کہ اس پر بے لاگ تبصرے ہوں، ان تبصروں سے نئی لکھنے والی کافی کچھ سیکھ رہی ہیں۔ بہت سی بچیوں میں بڑی صلاحیت ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ عورتوں کا فورم اس ہے اس میں مرد نہیں ہیں۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے جذباتی طور پر جڑ گئے ہیں۔ اور وہ تو یہ بچیاں ہی بتا پائیں گی کہ وہ کتنی مستفید ہو رہی ہیں۔ مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے کہ سب لوگ اپنی چیزیں ویب سائٹ پر ڈالتے ہیں۔ ہم نے کوئی موضوع طے کر لیا۔ جیسے ''افسانہ ایونٹ'' سب افسانے ڈالتے ہیں کوئی اس پر تجزیہ لکھتا ہے، جو نقاد ہیں وہ اپنے انداز میں تبصرہ کرتے ہیں۔ ہم لوگ یہ نہیں کرتے اور گروپس کی طرح کہ گروپ پر جس کا جو دل چاہا پوسٹ کر دیا اور پھر غائب ہو گئے نہ کوئی بحث و مباحثہ۔ ہم پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ ہم اس موضوع پر بحث و مباحثہ کریں گے۔ تو یہ بہت منظم تنظیم ہے۔ افسانہ، کوئی کہانی یا کسی کتاب کے بارے میں ہماری جو سرپرست ہیں تبصرے کرتی ہیں، زبان درست کرتی ہیں اور ہم لوگ بھی کہہ دیتے ہیں کہ بی بی یوں نہیں یوں ہے اور کوئی برا نہیں مانتا اس بات کا۔ تو بنات الحمدللہ بہت اچھی چل رہی ہے۔ یہ ایک طرح سے تنقیدی فورم ہے، تخلیقی فورم ہے۔ بہناپے کا فورم ہے۔

س: آخر میں آپ کچھ اپنے بارے میں کہئے۔

ج: میں بہت روشن دماغ ہوں۔ میں یہاں سوسائٹی میں رہتی ہوں یہاں بہت سے لوگ، ہم زبان بھی نہیں ہیں لیکن میں یہاں کی سوسائٹی میں بھی ہوں یہاں کی ایجوکیشن میں بھی ہوں اور تمام کام بہ حسن و خوبی انجام دیتی ہوں۔ مجھے یہ احساس نہیں ہوتا کہ مجھے اپنی ہم زبانوں یا اپنے ہم مذہب میں رہنا چاہیے۔ آرام سے رہتی ہوں یہ جو زندگی کا مثبت رویہ ہے مجھے میرے والد نے دیا۔

بچھڑے گلشن کی یادوں سے کب تک دل کو لہو کریں
جہاں بنالیں اپنا نشیمن پھول وہیں کھل جاتے ہیں

□□□

**Dr. Nisha zaidi**
B-63/S-2 DLF Colony
Dilshad Ext. - II, Sahebabad,
Dist. Ghaziabad -201005 (U.P)

شخصیت

سعدیہ اقبال

# قومی پرچم ترنگا کی ڈیزائنر

# ثریا طیب جی

ہمارے ملک کی آن بان شان ترنگا کے پیچھے ایک نام ہے اور وہ نام ہے ثریا طیب جی کا۔

ثریا طیب جی کوئی معمولی خاتون نہ تھیں۔ ان کا تعلق حیدرآباد کے تعلیم یافتہ اور مشہور خاندان سے تھا۔ وہ خود بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ انھوں نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی پینٹنگس سے لوگوں میں آزادی کا جوش پیدا کیا، وہ بہترین مصورہ تھیں۔ ثریا طیب جی نے جھنڈے کے ایک دو نہیں تقریباً 30 ڈیزائن پیش کیے تھے جس میں سے ان کے تیار کردہ ایک ڈیزائن پر آئین ساز اسمبلی کی تشکیل شدہ کمیٹی کے ارکان نے آخری مہر ثبت کی اور آج ثریا طیب جی کے تیار کردہ قومی جھنڈے کا ڈیزائن ہی ہر جگہ لہرا رہا ہے۔ جب تک ہندوستان کا قومی جھنڈا لہراتا رہے گا، ثریا طیب جی کا نام بھی اس کے ساتھ پوری شان کے ساتھ وابستہ رہے گا، ہم سلام پیش کرتے ہیں اپنی پہلی مسلم خاتون ثریا طیب جی کو جنھوں نے قومی جھنڈا ڈیزائن کر کے خواتین کا سر فخر سے اونچا کر دیا۔

ہمارا قومی ترنگا جس طرح ہندوستان کی شان ہے اسی طرح ثریا طیب جی پر بھی ہندوستان کو فخر ہے اور وہ ہندوستانی خواتین کے لیے بے مثال ہیں۔ ثریا طیب جی غیر معمولی شخصیت کی حامل تھیں۔ وہ حالات پر نگاہ رکھنے کے ساتھ ہی اسے کس طرح ہندوستانیوں کے حق میں کیا جائے اس بارے میں بھی پوری جانفشانی سے خاندان کے ساتھ متحرک رہتی

تھیں۔ وقت کے ساتھ کیسے قدم سے قدم ملا کر چلا جائے وہ اس فن سے بھی بخوبی واقف تھیں۔ وہ نڈر، ذی شعور، دور اندیش اور بے باک خاتون تھیں۔ طوفانی ہوا کے جھونکوں کا جرأت مندی سے مقابلہ کرنے والی پرعزم اور بہترین کریئٹر ثریا طیب جی نے ہندوستان کا قومی پرچم بنا کر جو مثال قائم کی، وہ قابل تعظیم ہے، ان کی خدمات اور مثالی کردار ہماری تاریخ کا روشن باب ہے۔

ہندوستان میں 1857 کے انقلاب کے بعد آزادی کے جنون نے لوگوں میں ایک جوش بھر دیا، دیکھتے ہی دیکھتے اس جنون کا حصہ ہندوستان کا بچہ، بوڑھا، جوان، مرد اور عورت سبھی ہو گئے۔ ایسے حالات میں ایک قومی جھنڈے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ گاندھی جی نے 1921 میں انڈین نیشنل کانگریس کی میٹنگ میں قومی جھنڈے کی تجویز پیش کی۔

23 جون 1947 کو ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی نے مملکت کا قومی جھنڈا تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ کمیٹی کے ارکان میں راجندر پرشاد، مولانا ابوالکلام آزاد، سروجنی نائیڈو، راج گوپال آچاریہ، کے ایم منشی اور ڈاکٹر امبیڈکر جیسے مشہور لیڈر شامل تھے۔ اس کمیٹی کا سکریٹری ایک سرکاری افسر بدرالدین فیاض طیب جی کو مقرر کیا گیا۔ قومی جھنڈا تشکیل دینے کے سلسلے میں کمیٹی نے کئی اجلاس کیے جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان کا قومی جھنڈا ایسا ہونا چاہیے جسے بھارت کی ہر نسل و مذہب کے لوگ تسلیم کرلیں۔ اسی فیصلے کے بعد یہ بحث بھی تیز ہوگئی کہ جھنڈے پر چرخے کا نشان دیا جائے یا نہیں۔

گاندھی جی چرخے کو خود انحصاری کی علامت سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے پیروکاروں پر زور دیا کہ وہ چرخہ استعمال کریں۔ بدرالدین فیاض نے کافی ریسرچ کے بعد گاندھی جی کو تجویز پیش کی کہ مجوزہ قومی جھنڈے پر 'اشوک چکر' دے دیا جائے۔

اشوک چکر مشہور ہندوستانی حکمران، اشوک اعظم (دور حکمرانی 268 تا 232 قبل مسیح) کا سرکاری نشان تھا۔ یہ چکر اور اشوک کے کئی احکامات دور اشوک میں تعمیر ہونے والے ستون پر ثبت ملتے ہیں، جو اشوک کی لاٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اشوک چکر 'دھرم چکر' سے ماخوذ ہے۔

بدرالدین فیاض نے گاندھی جی سے کئی ملاقاتیں کیں اور آخرکار انھیں اس امر پر قائل کرلیا کہ ہندوستانی قومی جھنڈے پر چرخے کی جگہ اشوک چکر دے دیا جائے۔ دیگر ارکان کمیٹی نے بھی اپنے سکریٹری کی تجویز قبول کرلی۔ اب مسئلہ یہ سامنے آیا کہ اشوک چکر پر مبنی قومی جھنڈا کس سے تیار کرایا جائے؟ ارکان کمیٹی کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی آزادی کے پہلے دن یعنی 15 اگست 1947 کو اپنا قومی جھنڈا سامنے لایا جائے۔ لہٰذا تب تک ضروری تھا کہ جھنڈے کو خفیہ رکھا جائے۔

بدرالدین فیاض نے ارکان کمیٹی کے سامنے اپنی بیگم ثریا کا نام پیش کیا جو سلائی کڑھائی میں ماہر تھیں۔ ثریا جی نے کہا کہ وہ خفیہ طریقے سے قومی جھنڈا تیار کردیں گی۔ ارکان کمیٹی نے بخوشی ان کی پیش کش قبول کرلی۔ بیگم ثریا اپنے گھر میں ہی قومی جھنڈا تیار کرنے لگیں۔ سینے پرونے اور سلائی کڑھائی میں بس ایک بااعتماد ملازمہ ان کی مدد کرتی تھی۔ اس طرح ایک مسلمان خاتون کو ہندوستان کا پہلا قومی جھنڈا تیار کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ بیگم ثریا نے اگرچہ دو جھنڈے تیار کیے تھے۔

15 اگست 1947 کو جب وزیراعظم ہندوستان، پنڈت جواہر لعل نہرو اپنی سرکاری گاڑی میں پارلیمنٹ کی طرف روانہ ہوئے تو اس پر بیگم ثریا کا تیار کردہ ہندوستانی جھنڈا ہی لہرا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کا بنایا دوسرا جھنڈا اسی دن آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں لہرایا گیا۔ بدرالدین فیاض طیب اور بیگم ثریا، دونوں منکسرالمزاج اور سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے کبھی ہندوستانی قومی جھنڈے کی تشکیل میں اپنے کردار کو نمایاں نہیں کیا۔ لیکن مغربی مورخین سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ رہ سکی کہ ہندوستان کا قومی جھنڈا تیار کرنے میں ایک مسلمان جوڑے نے اہم کردار ادا کیا۔

ان مورخین میں ایک مشہور برطانوی مورخ، ٹریور رائل (Trevor Royle) بھی شامل ہیں۔ ٹریور رائل نے 'برٹش راج کے آخری دن' (The Last Days of the Raj) کے نام سے ایک کتاب لکھی جو پہلی بار 1989 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تیاری میں ٹریور رائل نے ہندوستان کے سبھی ممتاز سیاسی رہنماؤں، دانشوروں اور ادبا سے انٹرویو کیے۔ اسی کتاب میں ٹریور نے ذکر کیا ہے کہ ہندوستان کے قومی جھنڈے کو آخری اور معین شکل ایک مسلمان جوڑے، بدرالدین فیاض اور بیگم ثریا نے دی تھی۔ مسٹر ٹریور رائل کی رو سے یہ ہندوستانی تاریخ کی متحیر کن بات ہے۔ ٹریور رائل شاید اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی تاریخ کی تشکیل میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی قومی جھنڈے کی تشکیل میں ایک مسلمان جوڑے کا اہم کردار ہے۔ اسی طرح ہندوستانیوں کا قومی نعرہ 'جے ہند' بھی ایک حیدرآبادی مسلمان، عابد حسن کی تخلیق ہے۔ علامہ اقبال کے مشہور زمانہ ترانۂ ہندی (سارے جہاں سے اچھا، ہندوستاں ہمارا) پر

ہندوستانی فوج مارچ پاسٹ کرتی ہے۔ لہٰذا ان حقائق کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ ہندوستان کی تشکیلِ نو کی تاریخ میں مسلمانوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔

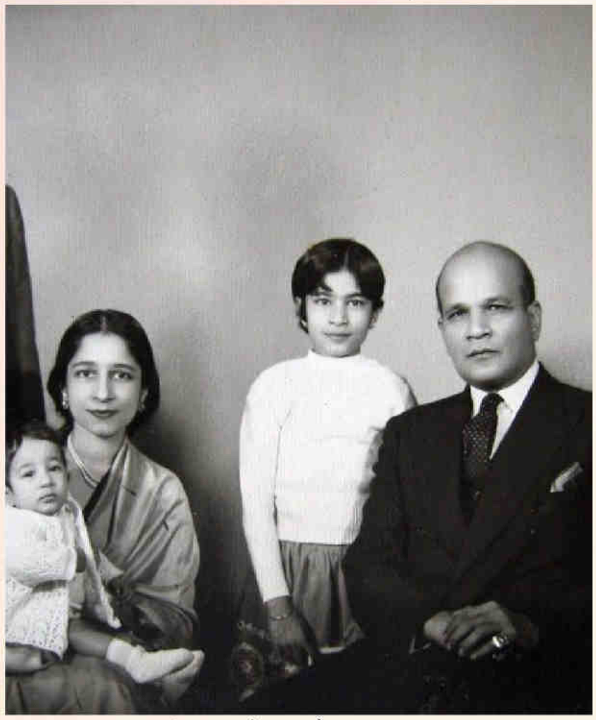

بدرالدین فیاض معمولی شخصیت نہیں تھے بلکہ بدرالدین فیاض ہندوستان کے پہلے بیرسٹر، بمبئی ہائی کورٹ کے پہلے ہندوستانی چیف جسٹس اور کانگریس کے پہلے مسلمان سربراہ، بدرالدین طیب کے پوتے تھے۔ انھوں نے بمبئی میں 1874 میں ایک تنظیم، انجمن اسلام کی بنیاد رکھی تا کہ مسلمانوں کو تعلیمی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی طور پر ترقی دی جاسکے۔ اگست 1906 میں جسٹس بدرالدین انتقال کر گئے۔ ان کے پوتے، بدرالدین فیاض 1907 میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ہندوستان کی سول سروسیز میں چلے گئے۔ ہندوستان آزاد ہوا تو انڈین سول سروسیز کا حصہ بنے۔

ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کے ڈپٹی سکریٹری اور پھر سکریٹری رہے۔ 1948 میں سفارت کار بن گئے۔ آپ کی صاحب زادی، لیلا طیب ممبئی کی مشہور سماجی رہنما ہیں۔ انھیں سماجی خدمات انجام دینے پر ہندوستان کا چوتھا بڑا قومی اعزاز، پدم شری مل چکا ہے۔

بدرالدین فیاض کی بیگم، ثریا کا تعلق بھی طیب جی خاندان سے تھا۔ وہ ان کے رشتہ داروں میں سے تھیں۔ آپ 1919 میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ 1978 میں وفات پائی۔ آپ ایک عمدہ مصور کے علاوہ سلائی، بنائی، امور خانہ داری، گھریلو انتظام، ہارس رائڈنگ کے علاوہ تیراکی میں بھی مہارت رکھتی تھیں۔ آپ کو بہترین مصورہ اور کڑھائی سلائی کے سبب ہی ہندوستان کا قومی جھنڈا تیار کرنے کی ذمے داری دی گئی، جسے آپ نے بخوبی نبھایا۔ ہندوستان کی مسلم خاتون نے قومی جھنڈے کو آخری شکل دے کر تیار کرنے میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ حقیقت تاریخ میں رقم ہے، جسے مٹایا نہیں جاسکتا۔

1935 میں آل انڈیا کانگریس نے ممتاز مورخ، ڈاکٹر بھوگا راجو پٹھبی ستیارامایہ (1880-1959) کو تاریخ لکھنے کی ذمہ داری دی، جو 890 صفحات پہ مشتمل ضخیم کتاب ہے۔ ستیارامایہ کا تعلق بھی آندھرا پردیش سے تھا، مگر انھوں نے پنگالی وینکایہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح 1957 میں جنگ آزادی 1857 کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ہندوستانی حکومت نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ ممتاز مورخ، ڈاکٹر تارا چند کو یہ ذمے داری سونپی کہ تحریک آزادی ہندوستان کے مجاہدوں کی تاریخ مرتب کریں۔ تارا چند کی مرتب کردہ چار جلدوں پہ مشتمل یہ تاریخ مستند سمجھی جاتی ہے۔ اس میں بھی پنگالی وینکایہ کا ذکر موجود نہیں ہے کہ انھوں نے ترنگے کو آخری شکل دی، ورنہ اس وقت تک تو یہ بات عام ہو جانی چاہیے تھی کہ انھوں نے ہی قومی پرچم ڈیزائن کیا۔

حیدرآباد سے تعلق رکھنے والی ایک تعلیم یافتہ خاتون اور بدرالدین طیب جی آئی سی ایس کی اہلیہ محترمہ ثریا طیب جی نے ہی قومی جھنڈا تیار کیا تھا، وہ حیدرآباد دکن کی ممتاز شخصیت سر اکبر حیدری کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ محترمہ ثریا طیب جی نے جہاں ملک کی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہیں اپنی پینٹنگس کے ذریعہ وہ لوگوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرتی رہیں۔ 22 جولائی 1947 کو 74 خواتین ارکان پر مشتمل تھی، جن میں بلبل ہند سروجنی نائیڈو، زہرا انصاری، زرینہ کریم بھائی، سکینہ نعمانی، قدسیہ عزیز رسول، شریفہ حامد علی، عائشہ احمد، اندرا گاندھی اور خود ثریا طیب جی جیسی خواتین شامل تھیں۔ 15 اگست ہو یا 26 جنوری لال قلعہ، راشٹرپتی بھون، سرکاری دفاتر کی عمارتوں، اسکولوں، کالجوں اور گلی گلی میں ثریا طیب جی کا ڈیزائن کیا ہوا قومی ترنگا لہرایا جاتا ہے۔ روز روشن کی طرح عیاں اس حقیقت کو چھپایا نہیں جاسکتا کہ جہاں ترنگا رہے گا وہاں ثریا طیب جی کا نام خود بخود موجود رہے گا۔

□□□

**Sadia Iqbal**
C-11, Sector 21
Noida-203001(U.P)

# شاعرات کے منتخب اشعار

پلٹ کے آئے تو دیوار و در نے حیرت کی
ہمارے ہاتھ میں تحریر تھی ہزیمت کی

لمحہ لمحہ جاں پگھلے گی قطرہ قطرہ شب ہوگی
اپنے ہاتھ لرزتے دیکھے اپنے آپ ہی سنبھلی میں

کشور ناہید

خیال میں تری تصویر یوں ابھر آئی
زمیں پہ جیسے کوئی اپسرا اتر آئی

ہمارے شہر تمنا کو یوں بھی لٹنا تھا
تمھاری شوخ نگاہی مگر ابھر آئی

ام ہانی

قربتوں کی آنچ میں جلنے سے کچھ حاصل نہ تھا
کیسے کیسے لطف اب یہ فاصلہ دینے لگا

جس سمت بھی جاؤں میں بکھر جانے کا ڈر ہے
اس خوف مسلسل سے مجھے کوئی نکالے

نور جہاں ثروت

بہار نے مری آنکھوں پہ پھول باندھ دیے
رہائی پاؤں تو کیسے حصار رنگ میں ہوں

نہ جانے کون سا فقرہ کہاں رقم ہو جائے
دلوں کا حال بھی اب کون کس سے کہتا ہے

پروین شاکر

کسی کی یاد نے لی تھی بس ایک انگڑائی
ہزار شعر کے مضمون آتے جاتے ہیں

وا ہیں دریچے کب سے گلستانِ شوق کے
مانند بوئے گل وہ خراماں کب آئے گا

اسما سعیدی

اٹا ہوا تیری خوشبو سے پیرہن دیکھوں
بھرے ہوئے ترے رنگوں میں دست و پا دیکھوں

وہ بکھری بکھری سی کیاریوں میں سفید کلیاں
وہ شام فرقت کی پیلی پیلی اداس خوشبو

عشرت آفرین

تاریک سرنگوں میں کرن کوئی تو چمکے
آنکھوں نے کسی رنگ کو دیکھا ہی نہیں ہے

مدتوں سے مری تصویر جکڑ رکھی ہے
میری خواہش ہے کہ شیشے کی یہ دیوار گرے

شائستہ یوسف

عمر گزری اک نگاہ لطف کی امید میں
ہم کو اپنے حوصلوں کی یہ ادا اچھی لگی

کبھی ہم سے پڑھی جاتی نہ تھیں چہروں کی تحریریں
مگر اب یہ کتابیں کس قدر آسان لگتی ہیں

ملکہ نسیم

ڈاکٹر صہیب عالم

# عائشہ عودہ کی خودنوشت

# أحلام بالحرية

عائشہ عودہ کی پیدائش رام اللہ کے ایک گاؤں دیر جریر میں 1944 میں ہوئی۔ اسرائیلی فوجیوں نے 1969 میں قیدی بنا کر ان کے ساتھ زبردست ظلم وجارحیت کا رویہ اختیار کیا۔ خاندانی گھر کو مسمار کردیا۔ 1970 میں اسرائیلی فوجی کورٹ نے عمر قید کی سزا سنادی۔ مزید مغربی قدس میں بم رکھنے کے الزام اور غیر قانونی تنظیم سے تعلق رکھنے کی پاداش میں 10 سال کی سزا سنادی۔

1979 میں قیدیوں کے تبادلے کے تحت ان کی رہائی ممکن ہو پائی۔ 1998 میں قائم شدہ ابن رشد اکیڈمی نے ان کے علمی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں انعام واکرام سے نوازا۔ یہ ادارہ مسلسل کسی نہ کسی ادیب کو اس کے تخلیقی ادب یعنی ناول، خودنوشت، سفرنامے، اور شعروشاعری پر انعام سے نوازتی ہے۔

عائشہ عودہ گرفتار ہونے سے قبل رام اللہ کے ایک اسکول میں علم

ریاضیات کی معلّمہ کی حیثیت سے تدریسی فرائض انجام دے رہی تھیں۔ 1967 کی عظیم فلسطینی جدوجہد میں آپ کا نام نمایاں ہوکر سامنے آیا۔

ادب السجون جدید فلسطینی ادب میں ایک نئے صنف کی حیثیت سے 1967 سے پروان چڑھ رہا ہے۔ اہم فلسطینی شعراء محمود درویش، سمیح القاسم، توفیق زیاد وغیرہ کو جب قید کیا گیا تو انھوں نے قید خانوں کے اندر بھی شعروشاعری کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک مشہور شاعر معین بسیسو نے مصر میں اپنی گرفتاری کے تجربے کو 'دفاتر فلسطیہ' (فلسطینی ڈائری) کے نام سے شائع کرایا ہے۔

یہ صنف یعنی ادب السجون کافی حد تک جدید عربی ادب میں اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ اس صنف میں مرد وعورت، ترقی پسند، تقلید پسند اور اسلام پسند ادباء وشعراء اپنی تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ ایسے افراد بھی اس میں طبع آزمائی کر رہے ہیں جن کے پاس نہ تو کوئی سیاسی رجحان ہے اور نہ وہ کسی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ صنف ڈائری، خودنوشت، ناول، اشعار، ڈرامے، شذرات، انٹرویوز کی شکل میں موجود ہے۔ عربی ادب سے دلچسپی رکھنے والے اسکالرس کے لیے یہ ایک اہم میدان کے طور پر سامنے آرہا ہے، یہ تحقیق کا ایک نیا در وا کر رہا ہے، اس کا تاریخی، سیاسی، سماجی اور تنقیدی جائزہ لیا جانا چاہیے۔

عائشہ عودہ نے ایک انٹریو کے دوران اپنی خودنوشت 'احلام بالحریۃ' کی تصنیف کا مقصد واضح کرتے ہوئے کہا کہ میرے لکھنے کا مقصد ہرگز ادب السجون کا حصہ بننا نہیں بلکہ میرا مقصد صرف اور صرف قید میں گزاری ہوئی زندگی کے کربناک تجربات کو سامنے لانا ہے تاکہ جو شخص جب چاہے اس سے واقفیت حاصل کر سکے۔ حقیقتاً میری یہ تحریر مزاحمتی ادب اور آزادی کے ادب کا حصہ ہے۔ قید ہماری جدوجہد کا ایک مرحلہ ہے۔ میں ادب السجون کی قیدی نہیں ہوں کیونکہ میں نے یہ تحریر قید سے آزاد ہونے کے بعد مختلف ایام میں تحریر کی ہے۔ میری تحریر کا مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا ہے جس کا فلسطین کی آزادی کے لیے کوشاں ہر فلسطینی اسرائیلی قید خانوں میں سامنا کر رہا ہے۔

عائشہ عودہ نے أحلام بالحریہ لکھتے وقت مکمل دیانت داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک انٹریو میں بیان کرتی ہیں:

''میں نے یہ خودنوشت لکھنے کے دوران حد درجہ امانت، سچائی اور دیانت داری سے کام لیا ہے۔ کیونکہ میرے ذہن ودماغ میں وہ تمام اذیتیں اور صعوبتیں نقش ہوگئی ہیں جیسا کہ میں نے اپنے ہیرکلپ سے قید خانے کی دیوار پر کندہ کیا ہے اور میں تاحیات اسے بھول نہیں سکتی۔ ممکن ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ اس کی شدت میں کمی آجائے لیکن ہمارے ذہن ودماغ پر اس کا نقش گہرا ہوتا جائے گا اور ممکن ہے آنے والے وقت میں اس سے محاسبہ اور نقد کرنے میں آسانی ہو۔ اور ممکن ہے کہ آنے والے وقت میں زبان میں کچھ نرمی آجائے اور میں آج جو ہوں وہ نہ رہ سکوں۔''

اس کتاب میں انھوں نے قید میں ہونے والے مزاحمتی تجربات کو، اپنے تجربات کو بھی اور اپنے رفقاء کے تجربات کو بھی، اور قید کے اندر اسرائیلی فوجیوں کے جبروظلم کو اجاگر کیا ہے۔ یہ قیدی کے نام کو پسند نہیں کرتی ہیں۔

أحلام بالحریہ 2005 میں پہلی بار شائع ہوئی جو کہ 166 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ نسائی ادب کا ایک مثالی نمونہ بھی ہے۔ قید کے دوران عائشہ اور ان کی قیدی ساتھیوں نے قید خانہ کو ایک انقلابی مدرسہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان کا پہلا مقصد جہالت کو ختم کرنا تھا اور دوسرا مقصد ثابت قدمی، امیدوں کی پرورش اور مایوسی کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنا تھا، اور نیا سورج اگنا ہی چاہتا ہے اس پر یقین کامل پیدا کرنا تھا۔

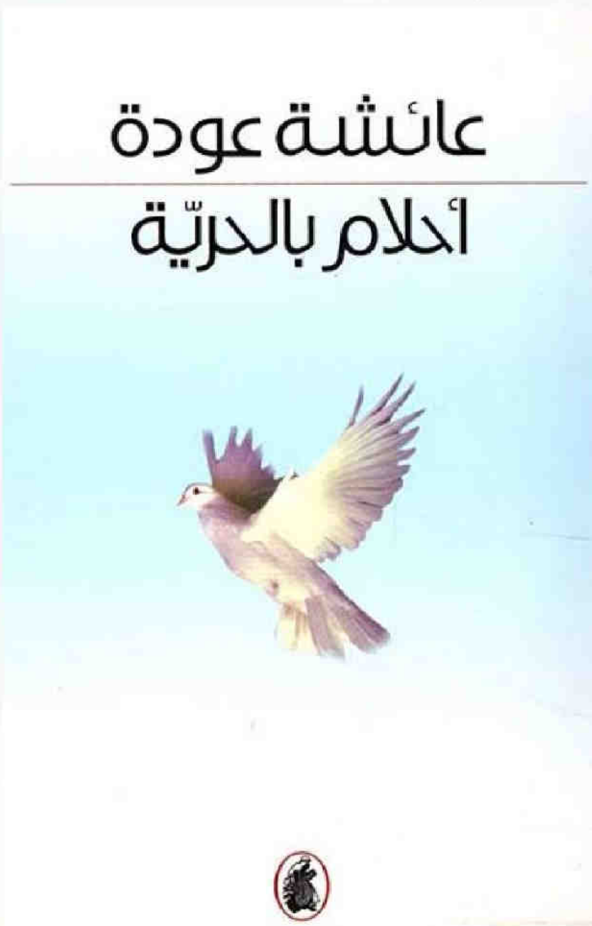

فنی پہلو سے اگر عائشہ عودہ کی خودنوشت کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انھوں نے ادب السجون کے ساتھ مزاحمتی اور نسائی ادب کو تقویت دی۔ 1969 سے 1979 کے دوران اسرائیل کی طرف سے ہونے والے ظلم وجبر، کربناک اذیتوں اور صعوبتوں کو انھوں نے مکمل طور سے پیش کیا ہے۔ ان پر جسمانی، ذہنی، معنوی، جذباتی اور وجدانی تمام خطرناک اور کربناک اذیتوں کا تجربہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ ان کے گھر کو ڈھا دیا گیا۔ انھوں نے قید میں جو دس سال گزارے یہ ان کے وہ ایام گزشتہ ہیں جس میں انہوں نے دوسرا جنم لیا۔

عورت ہونے کے باوجود عائشہ نے اپنے جسم وقلم سے اسرائیل کے خلاف مزاحمت جاری رکھی۔ اپنی اس خودنوشت کے ذریعہ عائشہ نے اسرائیلی جرائم، ظلم وبربریت، اوراذیتوں سے پردہ اٹھایا اور عام لوگوں کے سامنے اسے پیش کردیا تاکہ عورتوں اور مردوں کے ساتھ اسرائیلی قیدخانوں کی کہانی دنیا کے سامنے آسکے۔

أحلام بالحریہ کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے جب قاری اسے پڑھتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ایک لائیو ویڈیو چل رہا ہے جس میں یکے بعد دیگرے اس کے سامنے دل دہلا دینے والے منظر گزرتے جارہے ہیں۔ اس دوران قاری نہ اکتاہٹ محسوس کرتا ہے اور نہ اس کا ذہن ودماغ کتاب سے باہر نکل پاتا ہے۔

یہ کتاب مقدمہ کے علاوہ نو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب آزادی کا خواب، دوسرا باب آدھی رات، تیسرا باب تفتیش، چوتھا باب اعتراف جرم، پانچواں باب گویا کہ دیوار پھٹ گئی، چھٹا باب دوسرا جنم، ساتواں باب گنگناہٹ، آٹھواں باب اپنے دوستوں کے ساتھ اور نواں باب لکھنے کا تجربہ۔

عائشہ مسئلہ کا سرسری تجزیہ کرتی ہوئی نہیں گزرجاتی ہیں، بلکہ وہ اس قیدوبند کے بنیادی سبب کا برملا اظہار کرتی ہیں، ان کا ماننا ہے کہ اسرائیلی غاصب جب تک سرزمین فلسطین پر موجود رہیں گے، قیدوبند کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

”میں پہلی لڑکی نہیں ہوں اور نہ آخری، جب تک فلسطین اسرائیلی غاصبوں کے قبضے میں رہے گا ہماری جیسی لڑکیاں گرفتار ہوتی رہیں گی“۔

اسرائیلی جارحیت کس طرح مردوعورت میں تفریق کیے بغیر انسانیت کو شرمسار کرنے والی حرکتیں کرتی ہے، اس کا اندازہ عائشہ کے ان بیانات سے لگایا جاسکتا ہے جو وہ تفتیش کے دوران اپنے اوپر گزرے ہوئے دردناک لمحات کا تذکرہ کرتے ہوئے قلم بند کرتی ہیں:

”ان میں سے ایک نے میری چوٹیوں کی طرف دیکھا، اس کو زور سے پکڑا، اور ہوا میں مجھے اونچا اٹھایا اور زمین پر پھینک دیا اور ان کے قدموں نے مجھے روندنا شروع کردیا۔ دوبارہ اس نے میرے بال کی چوٹی کو اپنی طرف کھینچا اور مجھے اوپر اٹھایا اور زمین پر دے مارا، گویا کہ انھوں نے مجھے کھلونا بنا رکھا تھا اور ان لوگوں نے میرے ساتھ تین یا چار بار حرکتیں کیں۔“

”جب میں نے ان کے سوال کا جواب نہیں دیا تو اسرائیلی فوجی نے مجھے حرافہ کے نام سے پکارا اور کہا:

یہ حرافہ ایسے نہیں بولے گی۔“

”میرے پیچھے کھڑے شخص نے دو پائپ اٹھایا، اور میرے سر پر مارنے لگا، جیسے کہ ڈھول بجانے والا ڈھول پر مارتا ہے، میں نے اپنے سر کو بچانے کے لیے اپنے ہاتھ اوپر کیے، تو وہ میرے ہاتھ کے اوپر سے مارنے لگا۔“

”دوسرا شخص میری طرف بڑھا، میرے چہرے پر زور سے تھوکا، میں نے اپنے چہرے کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ اس نے دوبارہ تھوکا، اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو پیچھے کرکے کرسی سے باندھ دیا اور اپنے گھونسے سے میرے سر کے آخری حصہ پر مارنے لگا۔ میں نے اپنا توازن کھودیا۔“

”اس نے استہزاءً کہا: یہ حرافہ نہیں بولے گی۔ دوبارہ اس نے لوہے کے دو پائپ لیے اور میرے سر پر مارنے لگا، رکتا، مارتا، رکتا، مارتا، یکے بعد دیگرے...... یہاں تک کہ سر زخمی ہوگیا۔“

”ایک فوجی دروازہ پر کھڑا ہوا، کچھ بولا، جلد ہی ایک شخص پانی سے بھری بالٹی لے کر آیا، بغیر کچھ بولے میرے اوپر انڈیل دیا اور نکل گیا۔

میرا جسم سکڑ گیا، میرے دانت ٹھنڈک کی وجہ سے کڑکڑانے لگے، ٹھنڈک میری ہڈیوں میں گھس گئی، میں اپنے جسم کو سمیٹ کر ایک حصے کو دوسرے حصہ سے گرمی پہنچانے کی کوشش کرنے لگی، میرے دانت ٹھنڈ کی وجہ سے کڑکڑا رہے تھے، اور کانپ رہے تھے۔ ٹھنڈ میرے پورے جسم میں سرایت کرگئی۔ زمین بھی میرے لیے پناہ گاہ نہ بن سکی، میں قیدخانے کے ایک گوشے سے لگے دیوار سے چمٹ گئی، کچھ منٹ بعد دوسری بار پانی سے بھری بالٹی میرے جسم پر انڈیل دی گئی۔ میرا پورا جسم پانی سے بھیگ گیا۔ ٹھنڈک نے میرے پورے جسم کو لپیٹ لیا، میرے دانت پرانی کار کے انجن کی طرح کانپ رہے تھے۔“

عائشہ ان تمام اذیتوں اور صعوبتوں کے باوجود ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کے بارے میں کچھ بھی سننا گوارہ نہیں

کرتی ہیں۔ وہ اذیت خانے میں بھی اسرائیلی جارحیت پسندوں کو عار دلانے اور ان کو ان کی حیثیت دکھانے کا کام کرتی ہیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''ان میں سے ایک نے حقارت اور ذلت آمیز لہجے میں بات کرنا شروع کردیا۔

تم، تم، تم حقیر ہو، اسرائیل سے لڑنا چاہتی ہو، ھھھھھ

پھر اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولنے لگا:

اسرائیل سے پنگا،

اسرائیل نے تو بس چھ دنوں کے اندر تمام عرب ممالک کو شکست دے دی۔ اور وہ بھی چھ گھنٹوں میں۔ تم حقیر، ذلیل اسرائیل سے جنگ کرو گی۔ تم کند ذہن ہو، بے وقوف ہو۔

متکبرانہ لہجے میں بولا:

اس کی اس بات نے مجھے ہلا دیا۔ میرا غصہ پھٹنا ہی چاہتا تھا، میں نے اپنے غصے کو قابو میں رکھنے کی بھرپور کوشش کی، لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اس کے لہجے میں ایک جملہ کہا۔

اگر تم طاقتور اور مہذب ہو تو میری جیسی لڑکی کو مارنے کی کیا ضرورت؟

زور سے چیخا اور کہا، اپنا منہ بند کرو، منہ نہ لڑاؤ، جو ہم کہہ رہے ہیں سنو۔

اس نے عرب قوم کی عزت پر حملہ کیا۔ اور عرب کی قیادت پر بھی۔ اور کہا کہ عرب کی قیادت نے تو اپنے آپ کو بیچ دیا ہے۔''

''اگر تم طاقتور اور مہذب ہو تو میری جیسی لڑکی کو مارنے کی کیا ضرورت'' اس ایک جملہ میں اس نے اپنا مقام بھی بیان کردیا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور اسرائیلی جارحیت پسندوں کو ان کی حیثیت بھی یاد دلا دی کہ وہ کس قدر سطحیت اور گراوٹ کا شکار ہیں۔

عائشہ قید وبند کے ان ایام میں اپنی فلسطینی بہنوں کو نہیں بھولتی ہیں، انہیں یاد رکھتی ہیں اور انھیں اونچے اونچے عزائم سے مالا مال دیکھنا چاہتی ہیں، وہ چاہتی ہیں کہ فلسطینی لڑکیاں اپنے گھر اور بال بچوں سے آگے بڑھ کر ملک کی تعمیر وترقی اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں اس کے ساتھ شریک ہوں۔

''میرا مقصد ملک کی تعمیر ہے، صرف گھر کی تعمیر نہیں، میری زندگی کا مقصد صرف اپنے بچوں کے عدد بڑھانے کے بجائے عوام کی تربیت ہے۔ ان کی آزادی اور زندگی اس ناجائز قبضہ میں محفوظ نہیں ہے......''

''میرے خواب بڑے اور وسیع تر ہیں، جنھیں چھینا نہیں جاسکتا۔ اگر میں نہیں جلی اور تم نہیں جلے تو روشنی کہاں سے آئے گی۔''

عائشہ عزم اور حوصلے کا نام ہے، پوری کتاب میں اس کی یہ شان اور عظمت واضح طور سے نظر آتی ہے، تمام حالات کا سامنا کرنے کے باوجود اس کے قدم میں کہیں لغزش نہیں آئی، اس نے بے مثال ثبات قدمی کا مظاہرہ کیا، لکھتی ہیں:

''یہ وہ تحریر ہے جسے میں نے 33 سال بعد لکھا ہے۔ میں نے بم نصب کرنے کے سلسلے میں کبھی بھی لب نہیں کھولا۔ بہت سے لوگوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں اپنے اس جرأت مندانہ کارنامہ کو بیان کروں جیسا کہ وہ سمجھتے ہیں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ مجھے یاد ہے کہ فلسطین کی نسائی تنظیم کی سربراہ ڈاکٹر عصام عبدالھادی نے عمان میں اس سلسلے میں بات کرنے کے لیے بلایا، اور بہت سی طالبات نے اس سلسلے میں سوالات کیے، میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ گونا گوں کیفیت میں پایا۔''

آگے لکھتی ہیں:

اصل چیز عزم کے ساتھ فیصلہ لینا ہے............عزم ہی کامیابی کا ضامن ہے......

اس کے بالمقابل وہ اسرائیلی جارحیت کی کمزوری پر بہت ہی گہرا طنز کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

''زمین وآسماں سے وہ لوگ ہمارے خیمے پر بمباری کرتے ہیں، برباد کردیتے ہیں، قتل کرتے ہیں، پانی اور بجلی کاٹ دیتے ہیں۔ زمیں گھر اور درختوں پر بلڈوزر چلا دیتے ہیں۔ موت، ڈر، رعب اور بربادی کی کاشت کرتے ہیں......اور وہی لوگ......عمالقہ ہیں اور وہی فیصلہ کرنے والے ہیں۔''

عائشہ اپنی اور آزادیٔ فلسطین کے لیے جدوجہد کرنے والی اپنی تمام بہنوں کے آہنی عزائم کا اظہار ان لفظوں میں کرتی ہیں:

''مرد عورت سے افضل نہیں ہیں۔ عورت مرد سے کم نہیں ہیں۔ وطن، مستقبل، آزادی اور عزت نفس تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے اور ثبات قدمی ہمارا شعار ہے۔''

□□□

**Dr. Suhaib Alam**
Assistant Professor
Department of Arabic
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

ڈاکٹر محمد محسن

# علامہ اقبال

## کی شاعری میں خواتین

علامہ اقبال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فلاسفر بھی تھے اسی لیے ان کی شاعری ان کے نظریات کی ہی عکاسی کرتی ہے۔علامہ اقبال نے قوم کی اصلاح کو اپنا مقصد بنایا اور پھر اس مقصد کے تحت چند نظریات قائم کئے اور بعد میں انھیں نظریات کو انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم تک پہنچایا۔ ''تصورِ زن'' علامہ اقبال کے انھیں نظریات میں سے ایک تھا۔

قدرت نے مرد اور عورت کو الگ الگ اوصاف بخشے ہیں۔ جہاں مردوں کے حصے جسمانی قوت آئی وہیں قدرت نے عورت کو نزاکت، ملائمت، خوبصورتی اور دلکشی عطا کی۔ مگر دنیا کے آباد ہوتے ہی طاقت کا راج قائم ہوگیا اور عورت کے لیے کئی مسائل کھڑے ہوگئے۔ مردوں نے عورت کی نزاکت اور خوبصورتی کے سبب جہاں ان کو دل بہلانے کے طور پر استعمال کیا وہیں اپنی خدمت کے لیے بھی قید کر لیا۔ عورت کے احساسات اور جذبات کی خوب ناقدری کی گئی۔اس طرح مرد اساس طبقے میں عورت پر خوب مظالم ڈھائے گئے۔

چھٹی صدی عیسوی میں محمد ﷺ کے ذریعے اسلام کی تکمیل ہوئی اور اسلام پہلا مذہب تھا جس نے عورت کی اہمیت اور حفاظت کے لیے سخت اصول مرتب کیے۔ اسلام نے پہلی مرتبہ عورت کو روایتی زندگی سے نکال کر ایک نئی زندگی عطا کی۔ عورت کے اوپر ناجائز ظلم کو گناہ قرار دیا اور عورت کو چند پابندیوں کے ساتھ جینے کا حق عطا کیا۔ یہ پابندیاں لازمی تھیں۔ اسلام نے عورت کی اہمیت، حقوق اور فرائض کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور مرد کو کہیں بھی عورت سے برتر نہیں گردانا ہے۔ اسلام نے جہاں جنت کی کنجی عورت کے قدموں تلے رکھ دی ہو اس سے بڑھ کر عورت کے لیے اور کیا اہم ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ چند پابندیاں بھی لگائی ہیں جیسے حجاب اور مرد و زن کے درمیان ایک مقررہ حد وغیرہ، یہ دنیا کی بھلائی اور خوشحالی کے لیے ہیں۔

علامہ اقبال کا تصورِ زن سراسر اسلامی ہے۔ اسے ہم مشرقی نظریہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نظریے میں علامہ اقبال کا کوئی اضافہ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے خواتین کو وہی پیغام دیا جو قرآن و حدیث میں درج ہے۔ ان کے مطابق حضرت فاطمہؓ دنیا کی سب سے بہترین خاتون ہیں اور تمام خواتین کو چاہیے کہ وہ ان کو اپنا رول ماڈل بنائیں اور ان کی راہ پر چلیں۔ ذیل کے اشعار سے ہم تصورِ زن کے حوالے سے علامہ اقبال کی شاعری کا جائزہ لیں گے:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں
مکالمات افلاطون نہ لکھ سکی، لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

عورت کا وجود بنیادی ہے پھر اسی وجود سے دنیا چلی ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ عورت سے بڑھ کر کوئی خالق نہیں ہوسکتا چونکہ وہ انسانوں کی تخلیق کردہ ہے۔ ہر بچہ اسی سے جنم لیتا اور ہر بچے کا پہلا اسکول بھی وہی ہے یعنی قوم اور سماج کی بنیاد عورت سے ہے۔ کسی بھی قوم یا سماج کی تربیت کی پہلی ذمہ داری ایک عورت کے کندھوں پر ہی ہوتی ہے اور یہی عورت جب ماں کا روپ اختیار کر لیتی ہے تو دنیا میں اس سے اعلیٰ اور برتر کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' سے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

خواتین کی بہادری اور شجاعت کو اقبال قبول کرتے ہیں اور قوم یا سماج میں اس بہادری کی اہمیت کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ وہ عرب لڑکی فاطمہ بنت عبداللہ (جو غازیوں کو پانی پلاتی شہید ہوئی تھی) کے مرثیہ میں یوں لکھتے ہیں:

فاطمہ ! تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیان دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستاں خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

عورت کی تعلیم اور مغربی تعلیم کے خواتین پر اثرات کے متعلق بھی اقبال نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

وہ عورت کو دینی تعلیم دینے کے حق میں ہیں اور مغربی تعلیم چونکہ تہذیب کی راہ پر چلتی ہے وہاں دینی اوصاف شامل نہیں اس لیے علامہ اقبال خواتین کے لیے مغربی تعلیم کو رد کرتے ہیں۔

خواتین کے حوالے سے آزادیٔ نسواں بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ قدیم زمانے سے ہی خواتین اس کے لیے مزاحمت کرتی آئیں ہیں۔ اس مسئلے نے مغرب میں زیادہ طول پکڑا ہے۔ اقبال نے اس موضوع پر ''آزادیٔ نسواں'' کے نام سے نظم لکھی۔ ملاحظہ ہو:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں ، مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلو بند

وہ دین اور پردے کو عورت کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ پردے کے حوالے سے نظم ''خلوت'' کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

آغوش صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر و لیکن
خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر

واضح رہے کہ خلوت سے مراد پردہ ہے اور اگر پردے پر بات چلی ہے تو اقبال کی نظم ''پردہ'' پر بھی بات ہونی چاہیے۔ یہاں پردے کا تعلق آزادی سے نہیں بلکہ مرد و زن کی خودی سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا نے بے شمار انقلاب دیکھے مگر حاصل کچھ نہیں ہوا۔ مرد و زن کی خودی اب بھی پردے میں ہے۔ نظم ''پردہ'' ملاحظہ ہو:

بہت رنگ بدلے سپہر بریں نے
خدایا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے
تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے
وہ خلوت نشیں ہے ! یہ خلوت نشیں ہے

ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم
کسی کی خودی آشکار ا نہیں ہے

جہاں پردے کی بات ہوئی ہے وہاں حیا کا ذکر بھی لازمی ہے چونکہ حیا کی شناخت بھی عورت سے ہی ہے۔علامہ اقبال حیا کو عورت کا زیور سمجھتے تھے۔اس حوالے سے ان کی ایک فارسی رباعی ملاحظہ ہو:

نگاہ تست شمشیر خدا داد
بزخمش جان مارا حق بما داد
دل کامل عیار آں پاک جان برد
کہ تیغ خویش را آب از حیا داد

یعنی بے شک قدرت نے عورت کی شخصیت میں دلچسپ کشش اور جاذبیت رکھی ہے اور یہی کشش انسانی تولد کا باعث بنتی ہے مگر ماہرینِ اخلاق کی نگاہوں میں وہی عورت اعلیٰ مقام اور پُروقار شخصیت کہلانے کی مستحق ہے جو حیا کا مجسمہ ہو۔

مذکورہ بالا مسائل کے علاوہ ایک مسئلہ عورت کی حفاظت کا ہے۔ اکثر لوگوں کا کہنا ہے عورت کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔علامہ اقبال اس حوالے سے یوں لکھتے ہیں کہ:

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہیں مانا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

مذکورہ بالا بحث کے بعد یہ جاننا ضروری ہے کہ اقبال ایک عورت میں کیا اوصاف دیکھنا چاہتے تھے؟۔وہ کس قسم کی عورت کو مکمل عورت سمجھتے تھے؟۔جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں کہ اقبال نے تصورِ زن کو براہ راست اسلام سے لیا ہے اور اسلام نے حضرت فاطمہؓ کو تمام خواتین کا آئیڈیل بنایا ہے۔ اقبال بھی اسی نظریے کے قائل تھے۔انھوں نے بھی خواتین کے لیے حضرت فاطمہؓ کی راہ کو افضل مانا۔اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مزرعِ تسلیم راحاصل بتول
مادراں را اسوۂ کامل بتول

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گرداں ولب وقرآں سرا
فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوۂ زہرہ بلند

تا حسینے شاخ تو بار آورد
موسم پیشیں بہ گلزار آورد

آخر میں اس بحث کا خاتمہ ڈاکٹر نسرین اختر کے ان جملوں پر کرنا مناسب ہوگا۔وہ لکھتی ہیں کہ:

"اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمان کا دل اسلام کے اس سانچے میں ڈھل جائے جیسا کہ طواف کعبہ کے وقت عورت اور مرد اکٹھے طواف کرتے ہیں رسوم حج ادا کرتے ہیں مگر انھیں اپنے دلوں پر اپنے ارادوں پر اپنی خواہشات پر مکمل کنٹرول ہوتا ہے۔آپ مسلمانوں کی اسی اخلاقی بلندی کے متمنی ہیں تا کہ اس اخلاقی بلندی کی موجودگی میں مسلمان عورتیں بھی بلا خوف وخطر زندگی بسر کرسکیں۔"

(اقبال اور وجودِ زن، ڈاکٹر نسرین اختر، 1978، ص 42)

□□□

**Dr. Md Mohsin**
Assistant Prof.
Kirori Mal College
University of Delhi
Delhi-110007

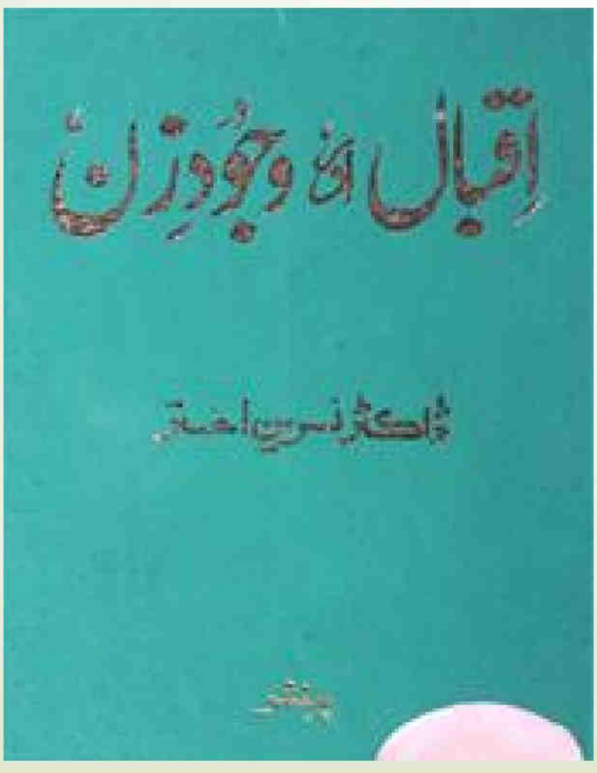

محمد یونس ٹھوکر

# تانیثیت اور اردو خواتین ناول نگار

انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہی تانیثی افکار وخیالات کی گونج شعوری یا غیر شعوری طور پر اردو ادب میں عموماً اور اُردو فکشن میں خصوصاً سنائی دینے لگیں۔ طبقۂ نسواں کے نازک اور سنجیدہ مسائل کو فکشن کے لبادے میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا جانے لگا۔ طبقۂ نسواں کی پسماندگی اور زبوں حالی کو مرد ادیبوں اور فکشن نگاروں کے ساتھ ساتھ خواتین قلمکاروں نے بھی موضوع بحث بنایا۔ البتہ خواتین قلمکاروں نے مردوں کے بعد لکھنا شروع کیا۔ کیوں کہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ برصغیر میں ایک طویل عرصے تک اُردو شعر وادب پر صرف مردوں کی اجارہ داری قائم تھی۔ خواتین کا اپنے خیالات کو قلم کے سہارے پیش کرنے کو مذہبی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ عشرت آفریں کا یہ شعر شاید اسی کی ترجمانی کرتا ہے۔

اتنا بولوں گی تو کیا سوچیں گے لوگ
رسم یہاں کی ہے لڑکی سی لے ہونٹ

عورتوں پر ادب کے تئیں عائد قدغن کا معاملہ کچھ اس قدر سنگین تھا کہ اول تو عورتیں یہ جرأت ہی نہیں کرتی تھیں کہ وہ ادب تخلیق کریں۔ اب اگر کوئی اکا دکّا عورت اپنی تخلیقی کوشش کرتی تو وہ اپنے اصلی نام کو مخفی رکھ کر فرضی ناموں سے اپنی تخلیقات شائع کرتی۔ ناول ''امراؤ جان ادا'' کا یہ شعر اس کی غمازی کرتا ہے۔

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی
ایمان بچ گیا، مرے مولا نے خیر کی

ناول کے مطابق اس شعر کا خالق مرد نہیں بلکہ عورت یعنی امراؤ جان ادا ہے، لیکن تانیث کا فعل نہ لانا ہی دراصل وہ جبر ہے جو عورتوں پر ادب کے حوالے سے مسلط تھا۔ اس تناظر میں معروف تانیثی مفکر ورجینا وولف کے اس خیال سے بھی اتفاق کرنا ناگزیر بنتا ہے کہ اگر کوئی عورت "Crime And Punishment" جیسا ناول تخلیق نہ کر سکی یا اس کے لیے اس جیسا ناول لکھنا سرے سے ہی ناممکن تھا تو اس کی کوئی وجہ نہیں سوائے اس کے کہ عورتیں ان تمام سہولتوں اور آسائشوں سے محروم رکھی گئی تھیں جو کہ مردوں کے لیے میسّر تھیں۔ غزال ضیغم نے اپنے ایک مضمون ''مرد اساس معاشرے میں خواتین ادیباؤں کے مسائل'' میں عورت پر قائم تخلیقی وادبی حد بندیوں کا یوں اظہار کیا ہے:

''مرد اساس معاشرے میں خواتین ادیباؤں کے لیے کہیں بھی کوئی صاف کھلی سڑک نہیں۔۔۔ خار دار راستہ۔۔۔ جہاں جگہ جگہ پر speed breaker بنے ہیں۔۔۔ بار

بار ٹھہریے۔۔۔ آگے نہ بڑھیے۔۔۔ آگے خطرہ ہے۔۔۔ سرخ سگنل ڈاؤن ہے۔۔۔ ہری اور لال بتیوں کے بیچ جلتی بجھتی خواتین ادیبائیں۔۔۔ ہر روز ایک شاعرہ ایک ادیبہ کی موت ہوتی ہے۔۔۔ ان کا ادب ان کی شاعری اس طرح مختلف طریقوں سے چھین لی جاتی ہے۔ ان کے ذہن کو کند کر دیا جاتا ہے۔۔۔''

(عتیق اللہ (مرتب)، بیسویں صدی میں خواتین اُردو ادب، ایچ۔ ایس۔ آفسٹ پریس، نئی دہلی 2002، ص151)

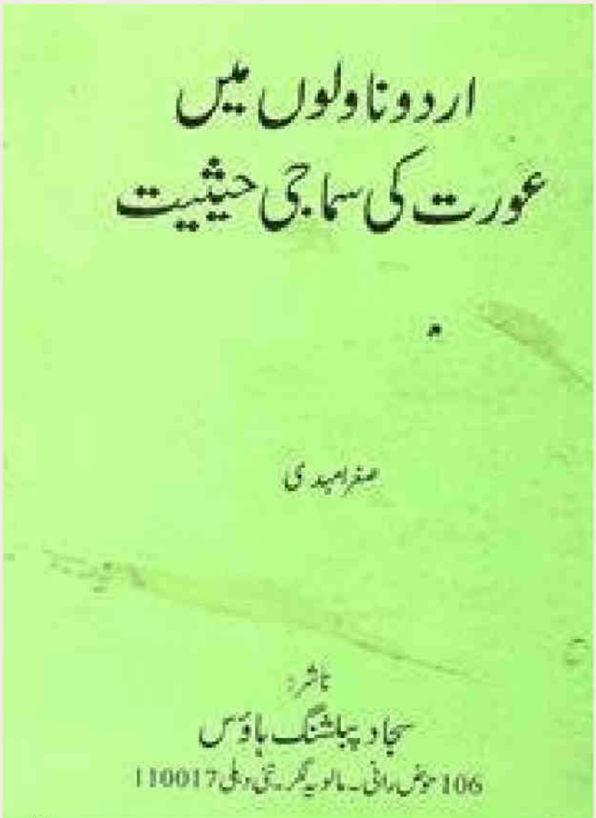


لیکن آہستہ آہستہ مختلف سیاسی و معاشرتی تحریکوں اور نئے تعلیمی نظام نے مختلف ادیبوں کی تخلیقات (جیسے نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' اور راشد الخیری کی ''صبح زندگی'' اور ''شام زندگی'')، مختلف رسائل جیسے تہذیب نسواں، عصمت، خاتون وغیرہ نے بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک آتے آتے اس بحر منجمد میں ارتعاش پیدا کیا۔ نتیجتاً پتھر پسیجا اور لوہا پگھلا، خواتین سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی اعتبار سے بیدار ہوئیں اور یوں خواتین کی تخلیقی صلاحیتوں کے بند پانیوں کو جوئے آب عطا ہوئی۔ ناول جیسی اہم صنف ادب میں طبع آزمائی کر کے خواتین قلمکاروں نے جہاں ایک طرف اپنی آراء و نظریات کے دریچوں کو وا کیا وہیں اس صدیوں پرانی پدرانہ فکر و فہم پر بھی خط تنسیخ کھینچی کہ عورتیں مردوں سے کمتر ہیں۔ کیونکہ ناول تخلیق کرنا یا اس صنف میں طبع آزمائی کرنا ایک وسیع اور جامع صلاحیت اور مطالعہ کائنات کا مطالبہ کرتا ہے جیسا کہ وحید اختر رقمطراز ہیں:

''ناول کے لیے زندگی کا گہرا اور وسیع مشاہدہ کرداروں اور پلاٹ کی پیچیدگیوں کو دیر تک اور دور تک سنبھالے رہنے کی صلاحیت اور دیرپا تخلیقی جذبہ چاہیے۔''

(وحید اختر، سخن گسترانہ بات، مشمولہ رسالہ ''الفاظ''، علی گڑھ، مارچ۔ اپریل 1981)

حالانکہ خواتین ناول نگاروں نے اس میدان میں شہسوار ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ خواتین پر ادب کے تئیں عائد پابندیوں کے باوجود کم تعداد میں ہی سہی لیکن خواتین نے مختلف ادبی کارنامے روز اول سے ہی انجام دیے۔ احساس کمتری کے باوجود ان کے شرار و نشتر قلم سے بہترین تحریریں پھوٹیں۔

چنانچہ ناول میں تانیثی فکر و شعور کی بو باس ترقی پسند تحریک سے پہلے بھی کہیں نہ کہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر ضرور ملتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے معرض وجود میں آنے سے قبل ہی 1932 میں ''انگارے'' کی اشاعت نے ہی اُردو ادب عموماً اور اُردو فکشن میں خصوصاً جو حقیقت پسندی اور روشن خیالی کی چنگاری پیدا کی تھی اس میں خواتین قلمکاروں کی بھی کاوشیں شامل تھیں۔ اس پر جوش مجموعے نے جہاں سماج کے نچلے طبقے کے جنسی اور نفسیاتی مسائل کو آئینہ دکھایا وہیں بے جا و بے بنیاد مذہبی رسوم اور پابندیوں پر بھی بے باکانہ احتجاج کیا۔ اردو ناول بھی فکری سطح پر اس اثر کو قبول کیے بغیر نہ رہ سکا۔ صغریٰ مہدی کی رائے سے اتفاق کیا جاسکتا ہے:

''انگارے نے تانیثیت کا ایک مضبوط تر نظریہ اُردو ادب میں داخل کیا۔ اُردو ناول نے اس نظریے کو اپنے رگ و پے میں شامل کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ طرز فکر اُردو ناول نگاری کا ایک ناگزیر حصہ بن گیا۔ عورتوں کے بے شمار مسائل اس میں سانس لینے لگے۔ کہیں کہیں یہ سانس للکار کی شکل اختیار کر گئی ہے۔''

(صغریٰ مہدی، اُردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت، سجاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2002، ص79)

پھر ترقی پسند تحریک نے اس رویے کو اور زیادہ استحکام بخشا۔ اس تحریک نے تانیثی افکار و خیالات کو پھلنے پھولنے اور ترویج پانے کے لیے ایک آزادانہ ماحول اور بنیاد فراہم کی۔ قرۃ العین حیدر اور ان کی ہم عصر عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، صغریٰ مہدی اور رضیہ فصیح جیسی خواتین ناول نگاروں نے بھی اسی تحریک کے عرصۂ حیات میں

ادبی منظر نامے میں اپنی شناخت قائم کی۔

بہر حال اس مؤثر ادبی تحریک کے منظر نامے پر قرۃ العین اور اس کے ہمعصر ناول نگاروں نے اپنے خلاق اور فعال تخیل کو سرگرم عمل لا کر اپنے ناولوں میں طبقۂ نسواں کی زبوں حالی، ان کے تشخص اور وجود، ان کی داخلی و خارجی حالات و کوائف، ان کی ذہنی و جذباتی کرب و عذاب اور گھٹن اور مرد اساس معاشرے میں ان کے خوابوں کی شکست و ریخت کو موضوع بحث بنا کر اپنی طرف سے طبقۂ نسواں کی حمایت کی۔ ان خواتین ناول نگاروں نے طبقۂ اناث کی مجروح شخصیت اور من جملہ مسائل کو آئینہ دکھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

اردو فکشن میں خواتین قلمکاروں میں سب سے پہلی واضح اور مستحکم تانیثی آواز عصمت چغتائی کی ہے۔ یہ قرۃ العین حیدر کی سب سے اہم ہمعصر خاتون ناول نگار ہیں جن کے ناولوں میں تانیثی افکار و خیالات کی باز آفرینی کی جا سکتی ہے۔ ان کا اسلوب اور انداز تحریر خالص تانیثی آواز کی غمازی کرتا ہے۔ خواتین کے سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کو بیان کرنے پر انھیں مکمل گرفت حاصل ہے۔ انھیں اس طبقہ کی زندگی کے جنسی اور نفسیاتی مسائل بیان کرنے پر خاصی مہارت ہے۔ عصمت کا ماننا ہے کہ عورت گھر کی چار دیواری میں مقید رہ کر ذہنی کرب و عذاب میں مبتلا رہتی ہے۔ انھیں اس کرب و عذاب سے نجات دلانا ہی ان کی تحریروں کا اصل جوہر ہے۔ شاید اسی لیے ان کی تحریروں میں درشتی اور شدت جھلکتی ہے۔ افسانہ ''لحاف'' پر اسی شدت پسندی اور بے باکی کے باعث ان پر مقدمے دائر ہوئے تھے۔ جنسی مسائل اور نفسیاتی پہلوؤں کو بڑی بے باکی سے بیان کرنا ان کے ہاں اتفاقی نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک مقصد کارفرما ہے اور وہ ہے آزادیٔ نسواں کا خواب۔ اس بے باکی کے پس پردہ ہی ان کی تحریروں میں انسان دوستی کی بہترین تصویریں ملتی ہیں۔ خود ان کا کہنا ہے:

> ''میں قصداً محض جنسی موضوع اٹھا کر نہیں لکھتی اس کے پیچھے میرا کوئی مقصد ہوتا ہے یعنی انسان کی آزادی کا سوال، عورت کی آزادی کا سوال جس کو میں حل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

(بحوالہ، قیصر جہاں (مرتب)، اُردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ، سلسلۂ مطبوعات، ڈی ایس اے پروگرام شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 2004، ص 195)

ان کے ناولوں ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصومہ، دل کی دنیا وغیرہ میں عورتوں کی زندگی کے تلخ حقائق کی ترجمانی ملتی ہے۔ سماجی ناہمواری اور طبقاتی کشمکش ایک معاشرے کے دو انتہائی سنگین ناسور ہیں۔ عصمت چغتائی کا تانیثی شعور اتنا راسخ اور پختہ ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں ایسے نسوانی کردار تراشے ہیں جو ان دونوں ناسوروں کے خلاف احتجاج کا پرچم بلند کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جہاں 'ٹیڑھی لکیر' کی 'شمن' ہر لحظہ اور ہر آن سماجی ناہمواریوں کے تھپیڑے کھا کر زندگی کے منظر نامے پر ابھرتی ڈوبتی نظر آتی ہے وہی 'ضدی' کی آشا طبقاتی کشمکش کے خلاف اپنی جان نچھاور کرتی ہے۔ شمن اپنے حقوق کی پامالی برداشت نہیں کرتی۔ وہ مردانہ سماج کی ظلم و زیادتیوں اور بدسلوکیوں کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتی ہے۔

شمن عصمت چغتائی کا ایک مضبوط اور جاندار کردار ہے اُردو کے تقریباً سبھی ناقدین نے اس کردار کی تعریف کی ہے۔ اس کردار کے توسط سے جہاں انھوں نے مردانہ سماج پر طنز کے تیر چلائے ہیں وہیں ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستانی سماج کے کھوکھلے پن کو قدرے واضح انداز میں منظر عام پر لانے کے لیے انھوں نے نوری کا کردار تراشا ہے۔ یہ ان لڑکیوں کی ترجمانی کرتی ہے جنھیں شوہر کی بے جا پابندیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ عصمت چغتائی کو عورت کی اس حیثیت سے چڑ ہوتی ہے جہاں عورت کا کام صرف بچوں کی پیدائش اور پرورش کے علاوہ گھرداری تک محدود ہو۔ ناول ''ٹیڑھی لکیر'' میں وہ اس کے خلاف احتجاج اور بغاوت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں:

> ''اسے نوری بالکل ایک گائے بیل کی طرح لگ رہی تھی۔ اکیاون ہزار میں وہ اپنی جوانی کا سودا کر کے ایک مرد کے ساتھ جا رہی تھی بیوقوفوں کی طرح نہیں۔ کاغذ لکھا کر اگر وہ بعد میں تڑپے تو اور پھندا اس کے گلے میں تنگ ہوتا جا رہا ہے اور وہ چغد بھی ڈھول تاشے سے خرید کر لے جا رہا ہے۔ آخر فرق ہی کیا ہے اس سودے میں اور آئے دن جو جاڑوں میں خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے وہ چھوٹا موٹا بیوپار ہے جسے کچالو، پکوڑیوں کی چاٹ اور یہ لمبا ٹھیلہ ہے۔ جب تک ایک فریق خیانت نہ کرے بیوپار چلتا رہتا ہے ورنہ سودا پھٹ۔''

(عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر، کتاب کار، رام پور، 1967، ص 211)

مرد اساس معاشرہ male dominated society کی بے اعتنائی اور غیر منصفانہ رویہ ہی شمن کی فطرت کو باغی اور سرکش بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ وہ مرد وزن سے شدید نفرت کرتی ہے اور کسی ایک کی بیوی نہ بن کر سب کی بیوی بن جاتی ہے۔ وہ ایک باغی لڑکی کی طرح سماج و معاشرے سے انتقام لیتی ہے۔ اس کا یہ انتقامی رویہ سماج کے ان کثیر تعداد لڑکیوں کی نمائندگی کرتا ہے جن کی خواہشات، احساسات،

نفسیات اور جذبات کو مردانہ سماج کے جبر وتسلط کے بل بوتے پر زیر کیا گیا اور نتیجہ کے طور پر ان کی شخصیت اور نفسیات میں ایک بھیانک دراڑ پیدا ہوئی۔عصمت چغتائی نے خود اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

''شمن کی کہانی کسی ایک لڑکی کی کہانی نہیں ہے۔یہ ہزاروں لڑکیوں کی کہانی ہے۔اس دور کی لڑکیوں کی کہانی ہے جب وہ پابندیوں اور آزادی کے بیچ ایک خلا میں لٹک رہی ہیں۔''

(عصمت چغتائی، (پیش لفظ) ٹیڑھی لکیر، کتاب کار، رام پور،1967)

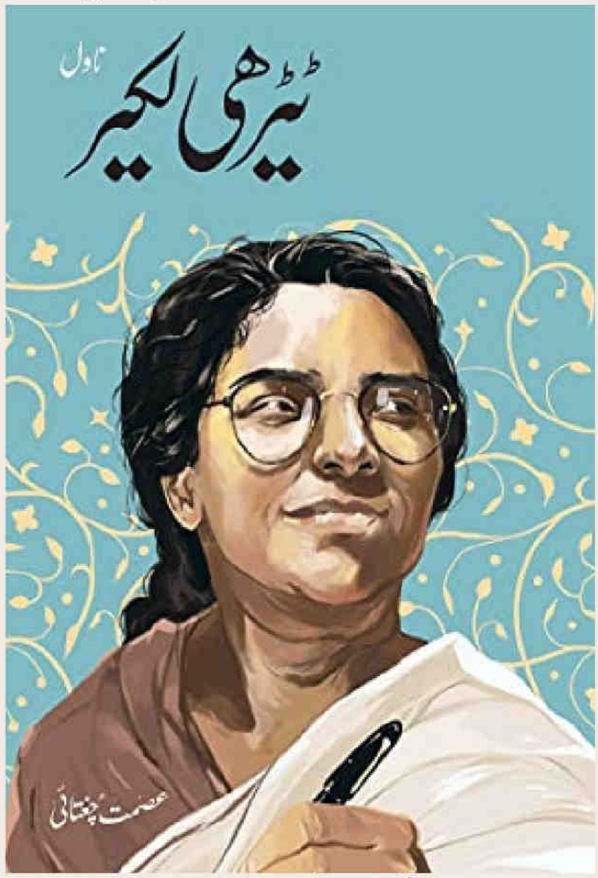


عصمت چغتائی کے نسوانی کردار تو احتجاج بن کر نمودار ہوتے ہیں۔''ٹیڑھی لکیر'' کی شمن مردوں کی برتری اور عورتوں کی کمتری، جیسی زیادتی سے تنگ آ کر چلا اُٹھتی ہے:

''ہنہ بدتمیز! چور اور حیوان کو حیوان کہنا بدتمیزی نہیں، راست گوئی ہے۔تم سمجھتے ہو کہ تمھارے بھونکنے سے میں ڈر جاؤں گی۔چاہے جو کچھ ہو تمھارے فریب کا حال ضرور لکھوں گی اس طرح دھوکہ دے کر تم بھاگ نہیں سکتے، اس کا انجام سوچ لینا''

(عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر، کتاب کار، رام پور،1967، ص291)

عصمت نے شمن کے کردار کے ذریعے ہندوستانی سماج و معاشرے میں زندگی گزارنے والی ایک ایسی عورت کی خوبصورت عکاسی کی ہے جو روشن خیال اور خوددار ہونے کی بنا پر ایک طرف آزادانہ زندگی گزارنے کی متمنی ہے اور بظاہر خودمختارانہ اقدام بھی اُٹھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

خدیجہ مستور کا نام بھی لینا از حد ضروری ہے۔ان کے دو اہم ناول ''آنگن''اور''زمین''جو بالترتیب1962اور1984میں سامنے آئے۔مذکورہ دونوں ناولوں میں تانیثیت کے دھندلے نقوش تلاش کیے جا سکتے ہیں۔خدیجہ مستور کا خاصہ یہ ہے کہ انھوں نے تانیثیت کی وکالت باغیانہ اور بے باکانہ انداز میں نہیں کی ہے بلکہ ان کے ناولوں میں تانیثی آواز کی حمایت بڑی دھیمی، سبک اور مدھم انداز میں پوشیدہ ہے جسے تلاش کر کے منظر عام پر لایا جا سکتا ہے۔انھوں نے تقسیم برصغیر کے پس منظر میں طبقۂ نسواں کے داخلی انتشار، روحانی کرب وعذاب، بے بسی اور احساس محرومی کا نقشہ صاف اور واضح کھینچا ہے۔

تقسیم ملک کے تناظر میں تحریر ہوئے ناول ''آنگن'' کے نسوانی کردار تانیثی فکر وشعور کے اعتبار سے لائق مطالعہ ہیں۔عالیہ نامی ایک نوجوان لڑکی مرکزی کردار کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔یہ ایک تعلیم یافتہ، سنجیدہ اور ذہین لڑکی ہے۔حالات اور وقت کے نشیب وفراز کا انھیں گہرا اور عمیق ادراک حاصل ہے۔ جب کسم دیدی کو اس کا شریر اور ظالم شوہر چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو سب کسم دیدی پر طعنے کستے ہیں اور بدنامی کے ڈر سے اس کے ساتھ ترک موالات بہتر سمجھتے ہیں۔لیکن اس سلسلے میں عالیہ کی سوچ کس قدر مثبت اور معتبر دکھائی دیتی ہے۔ملاحظہ ہو:

''اب اگر ان سے ملی تو لوگ انگلیاں اٹھائیں گے، وہ بد معاش جو مشہور ہو گئیں''''مگر لوگ اس آدمی کو بُرا کیوں نہیں کہتے جو انہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔؟''

''بس نہیں کہتے، لڑکی ہی کو برا سمجھتے ہیں، تم بھی اب بڑی ہو گئی ہو، ان کے گھر نہ جانا ورنہ لوگ اُنگلیاں اُٹھائیں گے۔''

(خدیجہ مستور، آنگن، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ2010، ص57)

جمیلہ ہاشمی کے ناولوں میں تانیثی آب ورنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔موصوفہ کے کئی ناول منظر عام پر آ چکے ہیں جن کو خاصی پزیرائی حاصل ہوئی۔ان ناولوں میں ''تلاش بہاراں''،''آتش رفتہ''،''چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو'' خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔''تلاش بہاراں'' کو1961میں پاکستان کے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ، آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔شاید اس کی مقبولیت کی وجہ بھی یہی ہو سکتی ہے ورنہ فنی اعتبار سے یہ اتنا زیادہ پختہ ناول نظر نہیں آتا کیونکہ اس میں بقول اقبال مسعود نفس وحدت کی کمی ہے۔

644 صفحات پر پھیلے ہوئے اس ناول کا موضوع متعین کرنا اگر چہ قدرے مشکل امر ہے تاہم اس کے بین السطور میں تانیثی فکر وشعور کی گونج ضرور سماعت کی جاسکتی ہے۔اس اعتبار سے اس ناول کی مرکزی نسوانی کردار کنول کماری ٹھاکرا اہم ہے۔اس کردار کو پیش کرنے پر ناول نگار نے پوری قوت صرف کی ہے۔اس کردار کے توسط سے جمیلہ ہاشمی نے مردانہ اقدار حیات اور جبر واستحصال کا توڑ پیش کیا ہے۔محسوس یوں ہوتا ہے کہ مصنفہ نے دراصل طبقہ نسواں کی زبوں حالی اور ظلم واستحصال کو اندر سے بھانپ لیا ہے اور اب یہ اس کردار کے طفیل خواتین کو جدوجہد کی تلقین کر کے آزادانہ زندگی حاصل کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔جیسا کہ نیلم فرزانہ لکھتی ہیں:

> ''تلاش بہاراں کا ''اسم'' دراصل ناول کے ایک کردار کنول کماری ٹھاکر کی کوششوں اور جدوجہد کا استعارہ ہے جو اس نے عورتوں کی بھلائی، ان کے حقوق کی حفاظت اور عورتوں کی عام ذہنی صورتحال کو بدلنے کے لیے کی۔اس ناول میں جتنے بھی اہم کردار پیش کئے گئے ہیں ان سب کی کہانی ہندوستانی عورت کی زندگی کے المناک پہلو کو پیش کرتی ہے۔ان کرداروں کے حوالے سے ناول کا موضوع ہندوستانی عورت کا مقدر قرار پاتا ہے۔''

(نیلم فرزانہ، اُردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2014ء،ص257-256)

جنگ آزادی اور تقسیم ملک کے پس منظر میں یہ ناول دراصل ہندوستانی سماج میں عورت کے استحصال اور مظلومیت کی عکاسی کرتا ہے۔ناول نگار نے اس کردار کی تخلیق کر کے اُس ظالمانہ اور استحصالی نظام کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کی ہے جہاں اس کی عزت وعظمت غیر محفوظ ہے۔اس کردار کے جملہ افعال، حرکات وسکنات اور خیالات وتصورات سے ہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس جابرانہ سماجی ومعاشرتی نظام کو تبدیل ہوتے دیکھنا چاہتی ہیں جہاں عورت کی حیثیت مخدوش ہے۔ناول کا مطالعہ کرتے وقت خود اس کردار کے یہ الفاظ اس بات کا عندیہ دیتے ہیں:

> ''زندگی کی بنیادیں بدلنے کی ضرورت ہے۔کام اور کوشش کی ضرورت ہے۔عام ذہنی سطح کو بدلنے کی ضرورت ہے اور میں یہ کام کروں گی۔''

(جمیلہ ہاشمی، تلاش بہاراں، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، 1961ء، ص27)

جیلانی بانو کا نام اُردو کے معتبر اور باوقار خواتین ناول نگاروں کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔'ایوان غزل'' اور ''بارش سنگ'' ان کے دو مشہور ناول ہیں۔جیلانی بانو کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے بے باک تخلیقی وادبی اظہار کے لیے معروف ہیں۔ان کے ناولوں میں جاگیردارانہ طرز معاشرت و آمرانہ شاہی نظام کے زوال کے پس پردہ خواتین کی زبوں حالی کی عکاسی ملتی ہے۔عورت کا سماجی وتہذیبی استحصال، مزدوروں کے ساتھ غیر انسانی سلوک، انسانی حقوق کا عدم تحفظ، شہری زندگی کی مجبوریاں وغیرہ ایسے چند اہم موضوعات ہیں جن سے جیلانی بانو کے افسانوں اور ناولوں کا خمیر تیار ہوتا ہے۔

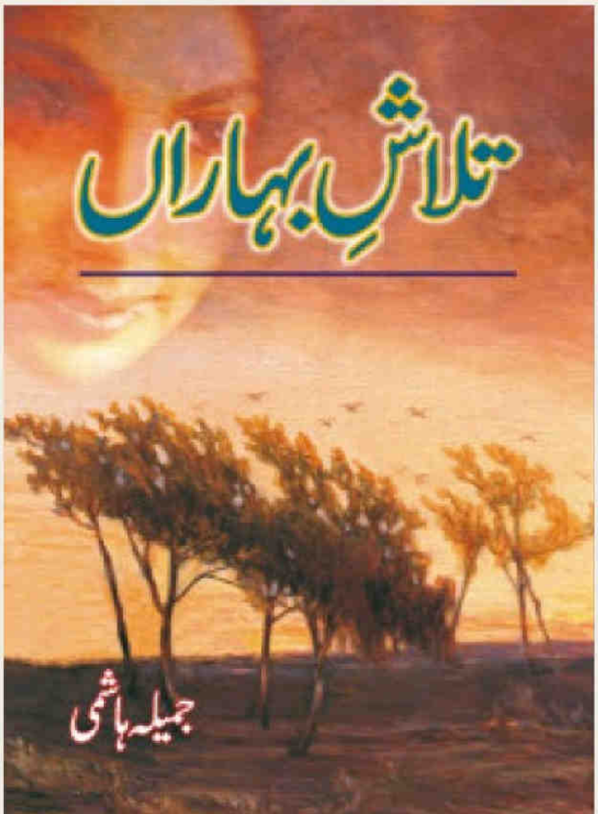


اس طرح مذکورہ بالا خواتین ناول نگاروں نے اپنی فکشن تخلیقات کے ذریعہ طبقہ نسواں کی زندگی کے کئی تاریک پہلوؤں کو ضیا بخشنے کی کوشش کی ہے۔ان ناول نگاروں کے ذریعہ ہی تصورات کے اظہار کی راہیں ہموار ہونے لگیں۔یہی نہیں بلکہ انھوں نے پیش رو ناول نگاروں کی کھیپ کے لیے تانیثی افکار ونظریات کی مشعلیں جلائی تاکہ وہ اپنے تانیثی فکر وفہم کے چراغ ان سے روشن کر کے ادب کے اندر اس فکر وفہم کو مزید جلا بخشے۔

□□□

**Mohd Younus Thokar**
Shirmal
Shopian-192305 (Kashmir)

بلقیس امین

# کرشن چندر کے ناول 'شکست' کا تجزیاتی مطالعہ

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ناول نگاروں میں ایک اہم نام کرشن چندر کا ہے۔ انھوں نے صنف ناول کی صورت میں اُردو ادب کو اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کیا ہے کہ اُن کا نام اردو ادب میں رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ اُن کی تحریروں میں جیتی جاگتی زندگی کا بھرپور اور رنگا رنگ تاثر ملتا ہے۔ اسلوب، بیان اور فن کی سطح پر انھوں نے جتنے تجربے کیے وہ اُن کی فنکاری کا بہترین ثبوت پیش کرتے ہیں۔ انھیں بحیثیت ناول نگار جو شہرت حاصل ہوئی، وہ کم ناول نگاروں کو حاصل ہوئی۔ ان کے یہاں رومانیت وحقیقت کا امتزاج ملتا ہے۔ اُن کے ناولوں میں زندگی کے حقائق کے ساتھ ساتھ رومانیت کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ وہ زندگی سے فرار اختیار نہیں کرتے بلکہ سیاسی، سماجی، معاشی، بنیادی حقوق کی پامالی اور سماجی نظام کی خامیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ کرشن چندر نے 47 ناول تصنیف کیے۔ ناول ''شکست'' اُن کا پہلا ناول ہے۔ جسے سجاد ظہیر کے ناول ''لندن کی ایک رات'' کے بعد دوسرا اہم ترقی پسند ناول قرار دیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو مخصوص نقطہ نظر سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اُن کا ناول 'شکست' ترقی پسند تحریک کے دوران لکھے گئے ناولوں میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست اپنی کتاب ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' میں اس ناول کے متعلق سے لکھتے ہیں:

> ''کرشن چندر نے اپنا ناول ''شکست'' 1943ء میں لکھا ہے۔ جدید دور کی ناول نگاری میں ''شکست'' اپنی بعض خصوصیت کے لحاظ سے امتیازی مقام رکھتا ہے۔ شکست میں فرسودہ نظام کے مقابلے میں صحت مند اور تازہ و توانا نوجوان کی فطری اور صحت مند محبت کی شکست پیش کی گئی ہے۔ ان دونوں کی کشمکش کو پیش کرتے ہوئے کرشن چندر نے فرسودہ نظام کی فولادی اور مضبوط گرفت کو ظاہر کیا ہے جس میں شیام اور ونتی کی محبت ہوتی ہے نہ ہی چندرا اور موہن سنگھ کا عشق کامیابی حاصل کرتا ہے۔''

کرشن چندر ترقی پسند تحریک کے تادمِ آخر حامی رہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس دلکش دنیا کی تلاش میں ان کا جھکاؤ رومانیت کی جانب رہا، لیکن اُن کی رومانیت حقیقت سے انکار کا نتیجہ نہیں بلکہ حقائق کے ادراک کا اظہار ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف سرمست

''شکست کی یہ رومانیت صرف رومانیت ہی نہیں ہے بلکہ اس دور کی حقیقت نگاری بھی ہے۔ ان کی یہ رومانیت صحت مند ہے، مریضانہ نہیں۔ کیوں کہ یہ حقائق کے ادراک سے پیدا ہوئی ہے۔ کرشن چندر نے ہندوستانی زندگی کے تلخ سماجی حقائق کو پیش کیا ہے اور اس کو بھرپور طریقے پر پیش کرنے کے بعد ہی اپنی رومانیت ظاہر کی ہے۔ اسی وجہ سے کرشن چندر کی رومانیت بھی وقعت رکھتی ہے اور اس ناول کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔''

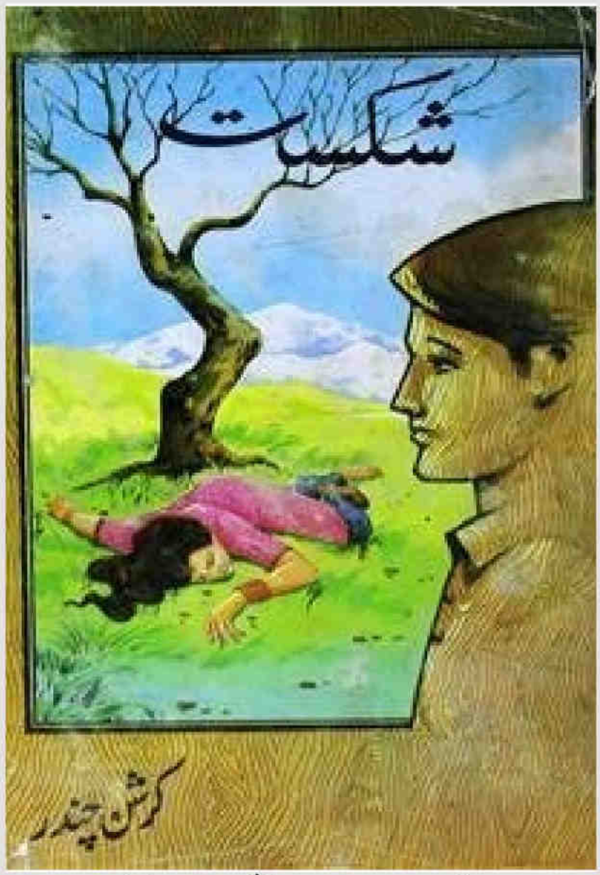


ناول ''شکست'' 216 صفحات پر مشتمل ہے اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ''تخیل'' ناول کے پہلے حصے کا عنوان ہے۔ اس میں نئے حالات اور نئی قدروں کے تحفظ کے لیے ذہن کو ہموار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس حصے میں نوجوان نسل کی بے اطمینانی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے کا عنوان ''عمل'' ہے۔ اس حصے میں روایت پرستی اور غیر فرسودہ سماجی بندشوں کی تصویر کشی کی گئی ہے اور سماج میں نچلے طبقہ کی محبت کو ہر طرح سے ناکام دکھایا گیا ہے۔ 'زیر آب' ناول کا تیسرا اور آخری حصہ ہے، جس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عملی جدوجہد میں بغاوت کرنے والے افراد ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ درد و غم کے اس ماحول میں موہن سنگھ، چندرا، شیام اور ونتی جیسے کرداروں کے دکھ درد اور المناک واقعے پیش کیے گئے ہیں۔

ناول ''شکست'' کے مرکزی کردار شیام، ونتی، چندرا اور موہن سنگھ ہیں۔ شیام، جو کہ ایم اے کا طالب علم ہے، وہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ 'ونتی' ایک اچھوت گھرانے سے وابستہ ہوتی ہے۔ ونتی بظاہر خوبصورت تو ہے، مگر عزم کے اعتبار سے کمزور ہے۔ اس کے برعکس 'چندرا' متحرک اور فعال کردار ہے اور ناول کے تمام کرداروں پر حاوی ہے۔ ناول ''شکست'' میں دو رومانی کہانیاں ایک ساتھ ہیں۔ ایک کہانی شیام اور ونتی کی اور دوسری چندرا اور موہن سنگھ کی، لیکن ان میں شیام روشن خیال ہوتا ہے۔ وہ سماج میں پیدا شدہ بنیادی مسائل جیسے ذات پات، اونچ نیچ اور مذہب کی تفریق کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے، جس کا ذکر اقوام متحدہ کے چارٹر اور ہندوستان کے آئین میں بھی کیا گیا ہے۔

ناول میں شروع سے لے کر آخر تک ہر جگہ بنیادی حقوق جیسے حق آزادی، حق مساوات، حقِ آزادیٔ اظہار جیسے حقوق کی پامالی کا ذکر کیا گیا ہے، جن سے ادنی طبقے کے افراد محروم تھے۔ موہن سنگھ ایک اچھوت لڑکی چندرا سے شادی کرنا چاہتا ہے، لیکن ذات پات کی تفریق کی بناء پر اُنھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اقوام متحدہ کے چارٹر CHARTER دفعہ 16 اور ہندوستان کے آئین دفعہ 1.16 کے مطابق ہر مرد اور عورت کو جب وہ بالغ ہو تو نسل، قومیت یا مذہب کی تفریق کے بغیر شادی کرنے اور ایک خاندان کو تشکیل دینے کا حق حاصل ہے:

لیکن انھیں اس حق سے محروم کرنے والا اعلیٰ طبقہ ہے۔ موہن سنگھ جو کہ جاگیردار طبقے سے وابستہ ہوتا ہے، اسے یہ اجازت نہیں دی جاتی ہے کہ وہ کمتر خیال کیے جانے والے خاندان کی لڑکی چندرا سے شادی کرے۔ حتی کہ اقوام متحدہ کے چارٹر دفعہ 162 میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ شادی اسی کو تسلیم کیا جائے گا جب دونوں کی اس شادی میں پوری مرضی اور آزادی شامل ہو۔

سماج کی رجعت پرست قوتیں، دھرم اور ذات پات کی تفریق کی بنیاد پر دو طبقوں کے درمیان دیوار حائل کر دیتی ہیں۔ ان رجعت پرست قوتوں کا پلہ بھاری پڑتے ہی دونوں کے مابین محبت کی کوئی قیمت نہیں رہتی اور اگر ان دونوں طبقات کے کچھ افراد باہم محبت کا رشتہ رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں ایسا نہیں کرنے دیا جاتا، نتیجتاً ان کی محبت رائیگاں ہو جاتی ہے۔ موہن سنگھ بنیادی حق (Right to Marriage) کو حاصل کرنے کے لیے سماج

سے بغاوت اور نفرت تو کرتا ہے، لیکن اسے حاصل کرنے کے بجائے انتقام کی آگ میں سلگتا رہتا ہے۔ 'چندرا' موہن سنگھ سے زیادہ ہوشیار اور فعال نظر آتی ہے، وہ سماج کی ظالم اور جابر قوتوں سے سخت نفرت کرتی ہے۔ چندرا کو اس بات کا بخوبی احساس ہوتا ہے کہ ذات پات کی تفریق کی بنیاد پر ان دونوں کی شادی نہیں ہوسکتی۔ انھیں اس بات کی اجازت نہیں دی جارہی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق شادی کرسکیں۔ اگر چہ اقوام متحدہ کے منشور دفعہ 2۔16 میں بھی اس کی اجازت دی گئی ہے۔ چندرا موہن سنگھ سے کہتی ہے:

''شاید تم یہ سمجھوگے کہ میں اچھوت ہوں، غریب ہوں، گاؤں والوں نے ہمیں باہر نکال رکھا ہے۔ اس لیے تم مجھ سے بے کھٹکے محبت کی میٹھی میٹھی باتیں کرکے مجھے دھوکہ دے سکتے ہو۔''

لیکن چندرا سخت جدوجہد کرنے کے باوجود بھی اپنے بنیادی حق Right to marriage کو حاصل نہیں کرپاتی ہے۔

ناول کا ایک اور کردار شیام سماج کے موجودہ طبقاتی نظام کو دیکھ کر سخت پریشان ہوتا ہے۔ اس کے اندر ہر فرد کے لیے ہمدردی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ سماج کے اقتصادی اور معاشی حالات دیکھ کر وہ پریشان رہتا ہے۔ وہ سماج کی ان فرسودہ رسومات سے تنگ آ کر کہتا ہے:

''دنیا کے آزاد انسان ایک آزاد انسان سے ایک دوسرے سے آزاد تعاون نہیں کرسکیں گے۔ اگر ان پر ظلم وستم نہ ڈھایا جائے تو کم از کم سکون کی زندگی گزار سکتے ہیں۔''

شیام جو کہ سماج میں تبدیلی لانا چاہتا ہے، اس کے نظریے کے مطابق ایک امیر اور غریب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف شیام کو اس بات کا احساس ہوتا ہے بلکہ اقوام متحدہ کے چارٹر دفعہ 7 میں بھی اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سبھی کو کسی امتیاز کے بغیر قانونی تحفظ کا حق حاصل ہے۔

وہ سماج میں پیدا شدہ بنیادی مسائل کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ ناول نگار نے اُس کے فقرے کی یوں تصویر کشی کی ہے:

''میرا بھی جی چاہتا ہے کہ ان مزدور عورتوں کا حسن جو یقیناً متوسط طبقہ اور امیر طبقے کی عورتوں سے زیادہ دلکش زیادہ ارفع ہوتا ہے۔ سالہا سال اسی طرح برقرار رہتا ہے۔ لیکن اس کے لیے اس سماج کے سارے نظام کو بدلنا ہوگا۔''

لیکن یہاں کہانی کا ایک اور رُخ سامنے آتا ہے۔ جب شیام اپنی مرضی کے مطابق ونتی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ شیام اور ونتی کی محبت کی خبر سنتے ہی شیام کے اہل خانہ ان کے مخالف ہوجاتے ہیں۔ شیام کی ماں اس سے مخاطب ہوکر کہتی ہے:

''چھایا اور ونتی نہ تو ہماری ذات سے، نہ برادری سے، نہ خاندان اچھا، نہ روپے پیسے والے، نہ عزت والے کوئی بات بھی تو ملتی نہیں۔ ہمارا ان کا نباہ کیسے ہوگا۔ گاؤں برادری بھی ان سے خفا ہے۔ سارے زمانے میں وہ بدنام اور رسوا ہے۔''

چوں کہ دونوں کی خاندانی حالت بالکل مختلف تھی۔ ونتی کی ماں برادری سے نکالی ہوئی ہوتی ہے، اس لیے شیام اپنے خاندان اور سماج سے بغاوت کرنے کی جرأت نہیں کرتا ہے۔ اگر چہ وہ ان بری رسومات کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ وہ موہن سنگھ کی طرح اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد تو کرتا ہے، لیکن کامیاب نہیں ہوتا ہے۔ دوسری طرف ونتی بھی احساس کمتری کا شکار ہوتی ہے۔ وہ اپنے خیالات وجذبات کا اظہار نہیں کر پاتی ہے۔ حتیٰ کہ اقوام متحدہ کے منشور دفعہ 19 میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو آزادئ رائے اور آزادی اظہار کا حق حاصل ہے۔

مذہبی لڑائی، ذات پات، چھوت چھات اور اونچ نیچ کی تفریق کی بناء پر دونوں اپنے بنیادی حق سے محروم ہوتے ہیں۔ شیام سماج کی ترقی کے لیے ان مسائل کو غیر ضروری سمجھتا ہے ناول میں اس منظر کی عکاسی بزبان شیام یوں ملتی ہے:

''میں تو ہندو مسلمان تو کیا دنیا بھر کے انسانوں کو بھائی سمجھتا ہوں اور انھیں الگ دیکھنے کے بجائے اکٹھا مل جل کر امن و آشتی سے ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ کرتے ہوئے ایک بہتر سماج اور بہتر نظام زندگی، ایک بہتر فلسفہ کی تعمیر کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ جب تک ایک انسان دوسرے انسان کو وہی حقوق نہ دے گا۔ جو وہ اپنے تئیں محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ دنیا میں کبھی امن وامان نہیں ہوسکتا۔''

شیام اور ونتی سماجی رسومات کا ڈٹ کر مقابلہ نہیں کرپاتے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں اور اپنا بنیادی حق کھو دیتے ہیں۔ ناول کا مطالعہ کرکے ہمارے ذہن میں یہ بات بار بار آتی ہے کہ سماج کے نچلے اور متوسط طبقات سے منسلک ہر فرد کی آواز کو دبایا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے متحد ہوجاتے تو انھیں حاصل کرکے ہی رہتے، کیونکہ وہ بھی اسی سماج کا حصہ ہیں، جہاں جاگیردارانہ طبقہ اپنی پہچان بناکر رکھتا ہے۔

ناول کا موضوع محبت اور رومان کے پس منظر میں بیان کیا گیا

ہے۔ ایک طرف وہ قوتیں نظر آتی ہیں جو سماج کے فرسودہ نظام کو بنائے رکھنے کی جدوجہد میں لگی ہوئی ہیں۔ جو مذہب، ذات پات، چھوت چھات کی تفریق اور طبقاتی مسائل کو قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ دوسری طرف وہ قوتیں جو سماج میں پیدا شدہ فرسودہ نظام سے بغاوت کرتی ہیں۔ ناول میں سب سے زیادہ متحرک کردار 'شیام' ہے۔ وہ اپنے نظام کو بدلنا چاہتا ہے۔ اسی طرح ونتی، چندرا اور چھایا نہ صرف اپنے دور کے بلکہ ہندوستان کی تاریخ کے زندۂ جاوید کردار ہیں۔ اُن کے اندر ہندوستانی عورتوں کی مظلومیت، بے بسی، دکھ درد کی تصویر جھلکتی ہے۔ ناول نگار نے سماج میں جابر روایت اور استحصال کے خلاف بغاوت کے اُبھرتے ہوئے جذبات کا ذکر چندرا کے ذریعے کیا ہے۔ وہ اعلیٰ طبقہ کے فرد موہن سنگھ سے محبت کرتی ہے، لیکن وہ اپنی محبت کو پانے کے لیے ہر طرح کی مصیبت خوشی سے برداشت کر لیتی ہے۔ وہ سماج کے ہر فرد سے لڑنے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ اپنی خود اعتمادی اور حوصلہ مندی سے سماج کی رجعت پرست روایتوں سے پردہ ہٹاتی ہے۔ کیونکہ اُسے سماج کے جاگیردارانہ طبقہ کے جابرانہ رویہ سے شدید نفرت ہوتی ہے۔ اسے نہ برادری کا خوف ہے اور نہ سماج کا۔ وہ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی ہے۔ اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتی ہے:

''برادری جائے چولہے میں، بھاڑ میں، برادری نے ہمیں کونسا سکھ پہنچایا ہے۔ جو میں اُن کی خوشامد کرتی پھروں اور پھر اب میری کونسی برادری ہے۔''

چندرا میں خود اعتمادی کا جذبہ شدت سے پایا جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبراتی نہیں بلکہ اس کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس کے برعکس موہن سنگھ چندرا سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن سماج میں حائل دیواروں کو توڑ نہیں سکتا ہے۔ اُس کے اندر چندرا کی طرح سماج سے بغاوت کرنے کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔ وہ اُن مسائل پر غور کرتا ہے، اس نظام کو بدلنا چاہتا ہے جو کہ فرسودہ ہے اور انسان کی ترقی کے لیے رکاوٹ ہے۔ اسی طرح شیام بھی رجعت پرستی سے سماج کو نجات دلانا چاہتا ہے۔ ناول کا ایک اور کردار پنڈت سروپ کشن ہے جو کہ جاگیردارانہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ذات پات، مذہب، اونچ نیچ کی تفریق کی بنا پر نچلے طبقہ کا استحصال کرتا ہے اور دولت کے ذریعے محبت کو خریدنا چاہتا ہے۔ جیسے کہ:

''کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ صرف ورق الٹنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ برادری والوں نے جیسے اپنی سانسیں بھی روک لی تھیں۔ ساری محفل کانپ رہی تھی۔ صرف مہاجن لوگ نہایت اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ سب لوگ بولتے پنڈت جی جو کچھ آپ نے کہا اس کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف صحیح ہے۔''

اسی کے ساتھ ہی ناول میں اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ وہ فرسودہ نظام جس کی پنڈت سروپ کشن نگرانی کر رہا ہے اس کی دیواریں اب ٹوٹنے والی ہیں۔ جیسا کہ اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے:

''اجنتا کی تصویروں پر نئی زندگی کی بنیا نہیں رکھی جا سکتی تھی جو اجنتا کے غاروں میں مدھم ہو رہی تھیں۔ پھر کس لیے یہ پنڈت سروپ کشن، یہ ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہا تھا۔ کسی طرح وہ سازش مکر و فریب کے داؤ چل کر تاریخ کے بہاؤ کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

ناول نگار نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے ہر جگہ کرداروں کے ذریعے ملک کے سیاسی، سماجی، طبقاتی اور معاشی نظام کی تبدیلی سے متعلق بحث کی ہے۔ جس سے اُن کے اشتراکی ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ ناول میں اس بات کو بھی ملحوظِ نظر رکھا گیا ہے کہ انسان دوستی، ہمدردی، سیکولرزم، مساوات، انصاف اور بنیادی حقوق کو حاصل کرنے کا جذبہ متوسط طبقے سے وابستہ افراد میں ہونا چاہیے۔ جو کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہر فنکار کا نصب العین تھا۔ جسے کرشن چندر نے ناول ''شکست'' میں بخوبی نبھایا ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے:

''کرشن چندر اس ناول میں بھی رومانیت ہی کے راستے آئے ہیں۔ اس کا ہیرو شیام سرتاپا شاعرانہ مزاج رکھتا ہے اور اس کی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ موجود معاشی اور طبقاتی نظام میں محبت کی ناکامی کا مسئلہ ہے، لیکن اس ناول کے بین السطور میں کرشن چندر نے معاشی کشمکش، فرسودہ رسوم و عقائد اور ذات پات کی بندشوں کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔''

غرض یہ کہ اس ناول کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جاگیردارانہ نظام کی درندگی اور اس عہد کی طبقاتی کشمکش کا بیان ناول میں جابجا ملتا ہے۔□□□

**Bilkees Amin**
Qasba Khull Noorabad
Damhal Hanjipora
Kulgam -192233 (J & K)

سید محمد ظفر اقبال

# مسائل نسواں کا عکاس
# مراۃ العروس

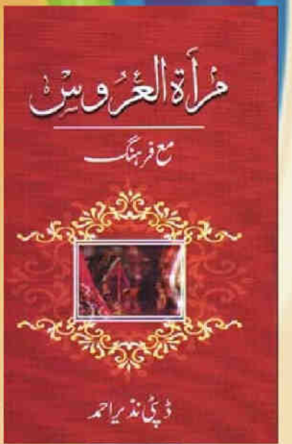


مراۃ العروس ڈپٹی نذیر احمد کا پہلا ناول ہے جو 1869 میں شائع ہوا۔ مراۃ العروس نہ صرف نذیر احمد کا پہلا ناول ہے بلکہ اسے اردو ناول نگاری میں بھی اولیت حاصل ہے۔فنی لحاظ سے اس ناول میں بہت سی کمیاں و خامیاں موجود ہیں جن کی بنیاد پر اس کی اولیت پر محققین و ناقدین کے درمیان اختلاف نظر آتا ہے لیکن بعد کی تحقیقات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مراۃ العروس سے ہی اردو ناول نگاری کا آغاز ہوا۔اردو ناول کے آغاز و ارتقاء پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں؛

”...جب کوئی اردو ناول کے ارتقاء کا جائزہ لینے بیٹھتا ہے اور سوچتا ہے کہ فن کے اس دل کش سفر کی پہلی منزل کون سی ہے، اس کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے تو اس کی نظر سب سے پہلے نذیر احمد کے ان ناولوں پر پڑتی ہے جنہیں بعض نقادوں نے ناول تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔اس انکار یا تامل کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ نذیر احمد کے جن قصوں کو متفقہ طور پر ناول کا نام دیا گیا ہے ان میں فن کے وہ لوازم موجود نہیں ہیں جن کا مطالبہ جدید ناول سے کیا جاتا ہے...“

(داستان سے افسانے تک:ص:61)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کی تائید ہوجاتی ہے کہ مراۃ العروس سے ہی اردو ناول نگاری کا آغاز ہوا۔اگرچہ اس میں وہ فنی لوازم موجود نہیں ہیں جن کا مطالبہ جدید ناول سے کیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے پہلی بار اردو میں باضابطہ طور پر ناول نگاری کی بنیاد ڈالی، چونکہ یہ ان کی پہلی کوشش تھی اور ان کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہیں تھا اس لیے مراۃ العروس میں کچھ خامیاں جگہ پا گئیں جن کو اگر پس پشت ڈال دیا جائے تو اس ناول کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور اسی لیے مراۃ العروس کو اس عہد میں کافی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور حکومت وقت کی جانب سے نذیر صاحب کو اس کاوش پر ایک ہزار روپئے کا انعام ملا۔

مراۃ العروس ایک اصلاحی ناول ہے جس میں مسائل نسواں خاص طور سے امور خانہ داری، تعلیم کی اہمیت و افادیت ، پرورش اولاد کے مسائل، سلیقہ مندی و سلیقہ شعاری، لڑکیوں کی شادی شدہ زندگی اور انہیں سسرال میں پیش آنے والے مسائل کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔نذیر احمد نے دو متضاد نسائی کردار یعنی اکبری اور اصغری کے ذریعے تعلیم و تربیت، خوش مزاجی، سلیقہ مندی، خوش اخلاقی ، ایثار، محبت اور جذبۂ خدمت جیسی خصوصیات کے فوائد کو بیان کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جن اشخاص میں یہ خوبیاں موجود ہوتی ہیں ان کی زندگی پرسکون اور خوش وخرم گزرتی ہے اور جو لوگ ان عادات صالحہ سے واقف نہیں ہوتے وہ ہمیشہ غمزدہ اور مفلوک الحال زندگی بسر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ’مراۃ

العروس' کے فن اور موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

''....مراۃ العروس کا موضوع امور خانہ داری یا مستورات کی اصلاح معاشرت کہا جاسکتا ہے یہ کہانی دہلی کے ایک متوسط شریف مسلمان خاندان کی کہانی ہے جس میں اس خاندان کے طرز معاشرت کی ہو بہو عکاسی کر کے یہ دیکھایا گیا ہے کہ کس طرح خواتین اپنی توہم پرستی، جہالت اور کج روی کی بنا پر ہمیشہ رنج وآلام کا شکار رہتی ہیں....''

(نذیر احمد کے ناول،تنقیدی مطالعہ:ص:56)

مراۃ العروس کا پس منظر دہلی کے ایک متوسط طبقے کا گھرانا ہے۔ نذیر صاحب نے اس گھر کے ماحول، پرورش، تربیت، رسم و رواج، رہن سہن اور طور طریقوں کو بنیاد بنا کر اس عہد کے متوسط طبقے کے گھرانوں میں خواتین کی تعلیم و تربیت کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ اس دور میں عام طور سے عورتوں کی تعلیم کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی بلکہ لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب تصور کیا جاتا تھا جس کے نتیجے میں جہالت اور توہم پرستی کی بنا پر گھروں میں لڑائی جھگڑے اور دوسرے مسائل پیدا ہوتے تھے۔ نذیر صاحب خود مراۃ العروس کے دیباچے میں رقم طراز ہیں؛

''...اس ملک میں مستورات کو پڑھانے لکھانے کا رواج نہیں مگر پھر بھی بڑے شہروں میں بعض شریف خاندانوں کی اکثر عورتیں قرآن مجید کا ترجمہ، مذہبی مسائل اور نصائح کے اردو رسالے پڑھ لیا کرتی ہیں....'' (مراۃ العروس:ص:1)

مراۃ العروس کو ڈپٹی نذیر احمد نے دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں اکبری کا قصہ بیان ہوا ہے جو اپنے والدین اور ننہالی اعزا کی چہیتی تھی۔ لاڈ پیار کی وجہ سے تعلیم وتربیت کی طرف توجہ نہیں دی گئی جس کے نتیجے میں اس کی شخصیت میں ایک کجی پیدا ہوگئی اور وہ ایک بدسلیقہ، بدمزاج، زبان دراز، پھوہڑ اور بدتہذیب عورت کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ جبکہ کہانی کا دوسرا حصہ اصغری کے واقعے پر مشتمل ہے۔ یہ اکبری کے بالکل برعکس ہے۔ نہ تو بچپن میں اس کا بہت زیادہ لاڈ پیار ہوا اور نہ ہی اس کی تمام خواہشات پوری ہوئیں چنانچہ اس کی شخصیت میں انکسار واعتدال، سلیقہ مندی وسلیقہ شعاری نظر آتی ہے۔

ناول کے شروع میں تقریباً چودہ پندرہ صفحات پر مشتمل نذیر صاحب تقریری انداز میں اصلاحی گفتگو کرتے ہیں جس میں مشاہدات دنیا کے فوائد، تعلیم وتربیت کی اہمیت، امور خانہ داری میں مہارت وغیرہ جیسے موضوعات پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آئندہ زندگی میں ان امور سے کس طرح فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ یہ ناول لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے مقصد سے تصنیف کیا گیا تھا اس لیے اس پوری اصلاحی گفتگو میں لڑکیوں کے ساتھ پیش آنے والے مسائل پر تفصیلی گفتگو موجود ہے۔

اس عہد میں خواتین کے ساتھ بڑا عجیب وغریب سلوک روا رکھا جاتا تھا اور انہیں لائق اعتنا تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ عورتوں سے کسی امر میں صلاح ومشورے کا تصور ہی نہیں تھا اور اگر کسی گھر میں بہت عزت وتوقیر عطا کی گئی تو صرف اس قدر کہ گھریلوں معاملات سے متعلق مشورہ کرلیا گیا۔ نذیر صاحب اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

''....گھر کی ٹہل خدمت کے علاوہ دنیا کا کوئی عمدہ کام بھی عورتوں سے لیا جاتا ہے یا کسی عمدہ کام کے صلاح ومشورے میں عورتیں شریک ہوتی ہیں؟۔ جن گھروں میں عورتوں کی بڑی عزت اور بڑی خاطرداری ہے وہاں بھی جب عورتوں سے پوچھا جاتا ہے تو یہی ''کیوں بی'' آج کیا ترکاری پکے گی؟....''

(مراۃ العروس:ص:20)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ جس عہد میں یہ ناول تحریر کیا گیا عورتوں کو کس طرح کے مسائل کا سامنا تھا، لیکن اس اقتباس سے یہ مفہوم نہیں نکالنا چاہیے کہ عورتوں پر بہت زیادہ ظلم وستم کا رویہ اختیار کیا جاتا تھا۔ دراصل اس عہد کی خواتین اپنی لاعلمی اور تعلیم کی کمی کی بنیاد پر کسی امر میں مشورہ دینے سے قاصر تھیں اور ناول نگار اسی طرف اپنے قاری کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

نذیر صاحب لڑکیوں کو اس حقیقت سے بھی باور کرانا چاہتے ہیں کہ والدین کے گھر مختصر ایام کا قیام ہے پھر شادی کے بعد دوسرے گھر جانا پڑتا ہے اور ایک نئے ماحول، نئے لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہوتی ہے اس عمل میں بہت سے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں، اگر اچھی تعلیم وتربیت ہوئی ہے تو انسان اپنی فہم وفراست اور ذہانت ولیاقت کی مدد سے ان مسائل کو خوبصورتی کے ساتھ حل کرسکتا ہے۔

اکبری جو اس ناول کا ایک اہم کردار ہے اس کی شخصیت میں تمام تر کمیاں وخامیاں موجود ہیں، چونکہ یہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کی چہیتی تھی اس لیے تعلیم وتربیت کی طرف بہت زیادہ توجہ نہیں دی گئی جس کے نتیجے میں اس کی شخصیت میں بہت سی خامیاں پیدا ہوگئیں جن کے اثرات شادی کے بعد رونما ہوئے۔ شوہر اور سسرالی اعزہ کے ساتھ اکبری کا رویہ مخلصانہ نہیں تھا۔ وہ ضد اور ہٹ دھرمی میں محلے کی ان عورتوں سے دوستانہ مراسم استوار کرتی ہے جنھیں اس کی ساس اور دوسرے اہل خانہ پسند نہیں

کرتے۔شوہراوراس کے گھر والوں کے ساتھ بدتمیزی اور بدتہذیبی کا رویہ اختیار کرتی ہے اور آخر کارلڑ جھگڑ کر الگ رہائش اختیار کرلیتی ہے۔ نذیر صاحب اکبری کے طرز زندگی اور شوہر، سسرالی رشتے داروں کے ساتھ تعلقات کو بہت تفصیل سے بیان کرتے ہیں ۔ یہاں صرف ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں اکبری اپنے شوہر سے جھگڑے میں مشغول ہے اور اپنے والدین کو برا بھلا کہہ رہی ہے؛

”....خدا کی قسم میں نے کہہ دیا مجھ سے زبان سنبھال کر بولا کرو نہیں تو پیٹ پیٹ کر اپنا خون کر ڈالوں گی۔ یہ کہہ کر رونے لگی اور اپنے ماں باپ کو کوسنا شروع کیا....“

(مراۃ العروس:ص:24)

اکبری کی چھوٹی بہن اصغری ہے۔اس کی تعلیم وتربیت پر شروع سے ہی توجہ دی گئی چنانچہ یہ ایک نہایت سلجھی ہوئی سلیقہ مند لڑکی کی شکل میں سامنے آتی ہے۔اس کی شخصیت میں وہ تمام صفات صالحہ موجود ہیں جن کی مدد سے ایک خوشگوار زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ نذیر احمد اصغری کی تعلیم و تربیت، سلیقہ مندی اور سلیقہ شعاری کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

”....بہت عقل مند فہمیدہ اور نیک مزاج تھی چھوٹی سی عمر میں اس نے قرآن شریف کا ترجمہ اور مسائل کی اردو کتابیں پڑھ لی تھیں۔لکھنے میں بھی عاجز نہ تھی گھر کا حال اپنے باپ کو ہفتے کے ہفتے لکھ بھیجا کرتی۔ ہر ایک طرح کا کپڑا سی سکتی تھی اور انواع و اقسام کے مزیدار کھانے پکانا جانتی تھی....“

(مراۃ العروس:ص:25)

اصغری کی شادی بھی اسی گھر میں ہوئی جہاں اکبری کی ہوئی تھی لیکن دونوں بہنوں کی شادی شدہ زندگی بالکل برعکس نظر آتی ہے۔اکبری نے جہاں اپنی ضد، بدتہذیبی، بداخلاقی اور کم علمی کی بنا پر اپنی زندگی کو دشوار بنالیا تھا وہیں اصغری نے اپنی تعلیم، تربیت اور حسن اخلاق سے اپنی زندگی جنت نشاں بنالی۔ نذیر صاحب اصغری کی شادی شدہ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں؛

”....اصغری نے گھر کے کام میں بتدریج اس طرح دخل دینا شروع کیا کہ شام کو محمودہ سے روئی منگا کر چراغ کی بتیاں بٹ دیا کرتی، ترکاری بنالیتی، محمودہ کا پھٹا ادھڑا کپڑا سی دیتی، ساس اور میاں کے لیے پان بنا دیا کرتی، شدہ شدہ باورچی خانے تک جانے اور ماما عظمت کو بھوننے بگھارنے میں صلاح دینے لگی....“(مراۃ العروس:ص:67)

اصغری نے صرف سسرال کو اپنا گھر ہی تصور نہیں کیا بلکہ وہاں کی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے انجام بھی دیا بلکہ اپنی علمی لیاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک مکتب بھی قائم کیا جس میں محلے کی لڑکیوں کی تعلیم و تعلم کا معقول نظم تھا۔اس مکتب کا اتنا شہرا ہوا کہ علاقے کے روساء بھی اپنی بچیوں کو اس مکتب میں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔اصغری نے صرف گھریلو معاملات کو خوبصورتی کے ساتھ انجام نہیں دیا بلکہ اپنی فہم وفراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے شوہر اور خسر کے ساتھ صلاح ومشورے میں بھی شریک ہوئی اور بہت سے گھریلو اور باہر کے معاملات کو حل کیا۔یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصغری اور اس کے خسر کے درمیان قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں جو صلاح ومشورہ ہوتا اس سے ایک چھوٹا سا اقتباس پیش کیا جائے؛

”....ماما نے کہا ایک کا حساب ہو تو میں زبانی بھی یاد رکھوں۔ بنیا، بزاز، قصائی، کنجڑا، حلوائی سب کا دینا ہے اور ہزاری مل کا حساب ایک الگ رقم ہے جس کو جتنا دینا ہو مجھ کو دیجیے دے آؤں آپ کے نام جمع ہو جائے گا۔مولوی صاحب تو سیدھے سادھے آدمی تھے دینے کو آمادہ ہو گئے اصغری نے کہا یوں علی الحساب دینے سے فائدہ، پہلے ہر ایک کا قرض معلوم ہو تب اس کو سوچ سمجھ کر دینا چاہیے....“(مراۃ العروس:ص:93)

مراۃ العروس میں ”ماما“ یعنی گھریلو کام کاج میں مدد دینے والی عورتوں کی بھی بہترین عکاسی موجود ہے کہ کس طرح یہ عورتیں گھر کی سیدھی سادھی خواتین کو اپنے چھل کپٹ میں پھنسا کر بیوقوف بناتی ہیں اور مختلف طریقوں سے انہیں لوٹتیں ہیں اور یہ بیچاری گھریلو خواتین اپنی کم علمی اور سادہ مزاج ہونے کی وجہ سے ان کے جال میں پھنس کر روپے پیسے برباد کرتی ہیں۔
مراۃ العروس کے مطالعہ کے بعد اس عہد کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اگرچہ اس ناول کا موضوع اصلاحی ہے اور خواتین کی تعلیم وتربیت اور امور خانہ داری کے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے لیکن ضمنی طور پر اس عہد کے سماج اور رسم ورواج کا عکس بھی نظر آتا ہے۔آج بھی اس ناول کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔عہد حاضر کے پس منظر میں اگر اس ناول کا مطالعہ کیا جائے تو آج کے معاشرے میں جو مسائل خواتین کو درپیش ہیں اس کا حل اور تدارک بھی اس ناول میں موجود ہے۔

□□□

**Syed Md Zafar Iqubal**
Research Scholar
Dept. of Urdu
AMU, Aligarh-200201 (U.P)

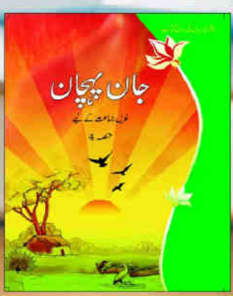


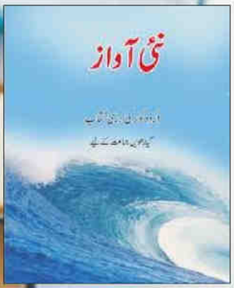


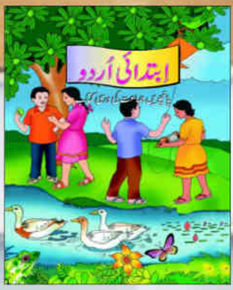


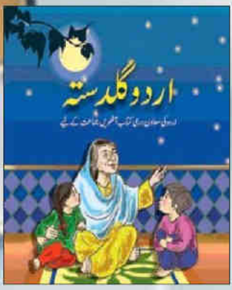


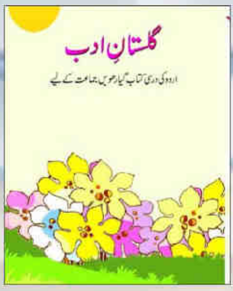

مہرین قادر حسین علی جان

# این سی ای آر ٹی

## کے نصاب میں شامل افسانے

ہندوستانی میں رائج درسی کتابوں میں سب سے اہم این سی ای آر ٹی یعنی نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کی کتابیں ہیں۔ بنیادی طور پر یہ سرکاری ادارہ ہے جو حکومت ہند کے زیر نگرانی کام کرتا ہے۔ 2005 کے قومی درسیات خاکہ میں یہ سفارش کی گئی ہے کہ بچوں کی اسکولی زندگی اور ان کی باہری زندگی میں ہم آہنگی اور ربط ہونا چاہیے۔ این سی آر ٹی کی کوشش رہتی ہے کہ وہ قومی درسیات کے خاکے پر سختی کے ساتھ عمل کرے اور ایسا نصاب تیار کرے جس میں طلبا کی زندگی کے ہر پہلو کو بہتر بنایا جاسکے۔ ان کے اندر تخلیقی صلاحیت کو فروغ دینے کے ساتھ ان کی ذہنی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی بھی کی جائے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اگر بچوں کو موقع، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل کی گئی معلومات سے نئی معلومات مرتب کرسکتا ہے۔

جہاں تک این سی ای آر ٹی میں شامل مواد کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ایک بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ نصاب تیار کرتے وقت کمیٹی نے اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ اردو کے تقریباً تمام اصناف کو اس میں شامل کیا جائے اور یہی سبب ہے کہ جب ہم نصابی کتاب کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ماہرین اور کمیٹی اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں صرف ایک حصے کو شامل کیا ہے۔ میری اس تحریر کا مقصد صرف اتنا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اسکولی نصاب میں این سی ای آر ٹی نصاب کمیٹی نے کن کن افسانوں کو شامل کیا ہے۔ ظاہر ہے اردو افسانے کی ایک تابناک تاریخ ہے اور ان میں سے پانچ دس افسانوں کا انتخاب کرنا نہایت ہی مشکل امر ہے۔ ایسے میں کمیٹی کے سامنے طلبا کی ذہنی عمر کا خیال رکھنا بھی ضروری تھا۔ اس مختصر سے مضمون میں، میں نے این سی ای آر ٹی میں شامل افسانوں کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

منٹو کا افسانہ ''جی آیا صاحب'' بھی کتاب میں شامل ہے۔ سعادت حسن منٹو اردو کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیوں پر لگائے گئے الزامات اپنی جگہ مگر ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے ہم اس سماج کی قبیح شکل دیکھ سکتے ہیں جس میں منٹو نے اپنی زندگی گزاری تھی۔ جہاں تک نصاب میں شامل کہانی ''جی آیا صاحب'' کا تعلق ہے تو یہ ایک لڑکے اور اس کے مالک کی کہانی ہے۔ قاسم اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ وہ نوعمر ہے مگر حالات نے اسے ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کردیا ہے کہ وہ دوسرے کے گھر کام کرنے کو مجبور ہے۔ اس کا مالک ایک پولیس انسپیکٹر ہے۔ قاسم کا مالک

پولیس انسپیکٹر اوراس کی بیوی اس سے بہت کام لیتے ہیں، انہیں قاسم کی فکر بالکل بھی نہیں۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ قاسم کی عمر کم ہے اور وہ کام کے دباؤ کی وجہ سے ڈھنگ سے آرام بھی نہیں کر پاتا۔ ایک دن جب کچھ مہمان آنے والے تھے انسپیکٹر نے پورے گھر کی صفائی کی ذمہ داری اس کے سر ڈال دی۔ وہ کام کر کے تھک گیا۔ اچانک اسے چاقو نظر آیا اور وہ اندر ہی اندر خوش ہو گیا۔ اس نے چاقو سے اپنی انگلی کاٹ لی تا کہ کچھ وقت کے لیے اسے کام کے بوجھ سے نجات مل جائے اور ہوا بھی ایسا ہی۔ ایک بار کامیابی ملنے پر قاسم نے یہ حرکت دہرائی۔ دو تین بار ایسی حرکت کرنے کی وجہ سے انسپیکٹر اوراس کی بیوی نے اس کی حرکت کو بھانپ لیا اور اسے نوکری سے نکال دیا۔ کہانی کا اختتام ایک ہاسپیٹل کے منظر پر ہوتا ہے۔ جہاں دو ڈاکٹر آپس میں بات کر رہے ہیں کہ انفیکشن بہت بڑھ گیا ہے اب اس کے ہاتھ کاٹنے ہوں گے۔ یہ دراصل قاسم ہی تھا جس کے بار بار انگلی کاٹنے کی وجہ سے اسے انفیکشن ہو گیا، زہر اتنا پھیل گیا کہ اس کے ہاتھ کاٹنے کی نوبت آگئی۔ اس کہانی کے دو رخ ہیں ایک تو یہ کہ چھوٹے بچوں سے کام کرانا قانوناً جرم ہے، دوسری بات ہمیں اپنے ملازمین کا بھی خیال رکھنا چاہیے، ملازم ہونے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ وہ تھکتا نہیں ہوگا، ہمیں اس کے آرام کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ پریشانیوں کا سامنا کرنا بہادری ہے۔ اس سے بچنے کے لیے کوئی ایسی حرکت یا خود کو جسمانی تکلیف پہنچانا عقلمندی نہیں ہے۔

نویں جماعت میں پریم چند اور صالحہ عابد حسین کا ایک ایک افسانہ شامل ہے۔ ابتدا میں افسانے کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ پھر پریم چند کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور اس کے بعد پریم چند کا افسانہ ''حج اکبر'' کا متن دیا گیا ہے۔ پریم چند نے اردو افسانہ نگاری کو بام عروج پر پہنچایا، ان کے معترضین لاکھ خامیوں کی نشاندہی کریں مگر پریم چند کے بارے میں ایک بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ پریم چند نے اردو افسانے کی جو بنیاد رکھی آج اردو افسانہ اس پر ٹکا ہے۔ جہاں تک افسانہ ''حج اکبر'' کا تعلق ہے تو یہ افسانہ ایک مسلم متوسط گھرانے سے متعلق ہے۔ اس کہانی میں عورتوں اور بچوں کی نفسیات کو نہایت سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان ثواب کی نیت سے جو عمل کرتا ہے اس کی اپنی اہمیت ضرور ہے مگر کئی بار حالات ایسے بن جاتے ہیں جب انسان مذہبی فرائض کی جگہ حقوق العباد پر توجہ دیتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حقوق العباد بھی عبادت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کہانی کا آخری حصہ دیکھیے:

''آخر صابر حسین کا مکان آپہنچا۔ عباسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا۔ جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم لڑکا شام کو بھوکا پیاسا گھر آئے۔ اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔ دروازہ پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ باورچی بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ عباسی کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولٹس پکا رہی ہے۔ کلیجہ مضبوط ہوا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی تو اس کا دل گرما کی دوپہری دھوپ کی طرح کانپ رہا تھا۔ شاکرہ نصیر کو گود میں لیے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔ غم اور یاس کی زندہ تصویر۔

عباسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ نصیر کو اس کی گود سے لے لیا۔ اور اس کے منہ کی طرف چشم پرنم سے دیکھ کر کہا،

''بیٹا! نصیر آنکھیں کھولو۔''

نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ تک دایہ کو خاموش دیکھتا رہا۔ تب یکا یک دایہ کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا، ''انا آئی۔ انا آئی۔'' نصیر کا زرد مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل جائے۔ ایسا معلوم ہوا گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔ صابر حسین نے آکر اسے گود میں اٹھالیا اور پیار کر کے بولے۔ ''تمھاری انا کو مار کر بھگا دیں؟''

نصیر نے منہ بنا کر کہا، ''نہیں روئے گی۔''

عباسی بولی، ''کیوں بیٹا! مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب کون دے گا؟''

صابر حسین نے مسکرا کر کہا، ''تمھیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہو گیا۔ اس حج کا نام حج اکبر ہے۔''

اس کہانی کے مطالعہ سے ہمیں خدمت خلق کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمیں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد دونوں پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ انسان کی شناخت اس کے کام سے ہوتی ہے، کسی کو کمتر اور حقیر سمجھنا انسانیت کے خلاف ہے۔

صالحہ عابد حسین کا افسانہ ''مگر وہ ٹوٹ گئی'' ہے۔ اس کہانی کا مرکزی خیال عورت ہے۔ خاص طور پر وہ عورت جو سماجی بندشوں کا سامنا کرتی ہے اور مصیبت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔ عورت کی زندگی کے کئی

پہلو ہوتے ہیں۔ کئی مرتبہ وہ ان مظالم کے خلاف آواز بلند بھی کرتی ہے۔ مگر جس زمانے میں یہ افسانہ لکھا گیا تھا اس وقت عموماً عورتیں مصیبت کے ان لمحات کو اکیلی ہی جھیلتی تھیں بلکہ صحیح معنوں میں عورتیں مجبور تھیں۔ صالحہ عابد حسین نے اپنے افسانے میں عورتوں کی اسی کہانی کو پیش کیا ہے۔

سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''نیا قانون'' دسویں کے نصاب میں شامل ہے۔ منٹو کا شمار اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، حالانکہ منٹو کے معترضین کی تعداد بھی کم نہیں جو منٹو کو فحش نگار کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ افسانہ نگار کو افسانہ نگار ہی تسلیم کرنا چاہیے منٹو کے عہد میں بھی لوگوں نے جب ان پر فحش نگار ہونے کا الزام لگایا تو منٹو نے اس کے جواب میں کہا تھا ''ہماری تحریر میں آپ کو کڑوی کسیلی لگتی ہیں مگر اب تک جو مٹھاس آپ کو پیش کی جاتی رہی ہے ان سے انسانیت کو کیا فائدہ ہوا ہے ......نیم کے پتے کڑوے سہی مگر خون ضرور صاف کر دیتے ہیں۔' منٹو کی کہانیوں میں جنسی مسائل کو ضرور بیان کیا گیا ہے مگر ان کی بیشتر کہانیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ منٹو ماہر نفسیات تھے، انھوں نے اپنی کہانیوں میں سماج میں پھیلی گندگی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اور ظاہر ہے کنوئیں کی گندگی صاف کرنے کے لیے کنواں میں اترنا ہوتا ہے اور یہی کام منٹو نے کیا۔ بہرحال منٹو کی تمام کہانیوں میں جنس موضوع نہیں ہے بلکہ ان کی بہت سی کہانیوں میں سماجی اور سیاسی جبر کو دکھایا گیا ہے۔ 'نیا قانون' بھی اسی ضمن کا افسانہ ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار منگو کوچوان ہے۔ افسانے میں اس کی شخصیت یوں پیش کی گئی ہے۔

''منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرف واقف تھے۔''

کہانی کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ کسی نئے قانون کی آمد ہے اور لوگوں کو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ نئے قانون کے آتے ہی ان کی تمام پریشانیوں کا حل بھی نکل آئے گا۔ مگر کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔ دراصل عام انسان کو ہمیشہ مشکلات کا سامنا ہی کرنا پڑتا ہے۔ منگو کوچوان کے ذریعے منٹو نے بھی ان ہی مسائل کی جانب توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ منٹو کے افسانہ 'نیا قانون' کے بارے میں ابواللیث صدیقی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کافی اہم ہے:

'''اس افسانے میں منٹو کا کوئی کمزور پہلو نہیں ابھرتا۔ یہ ہماری سیاسی جد و جہد کے دور کا آئینہ ہے جس میں ہماری آرزوئیں، امنگیں، تمنائیں اور ناکامیاں جھلکتی ہیں اور فنی معیار سے بھی ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اچھے مختصر افسانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں واقعات کا تانا بانا زیادہ نہ بکھرا ہو۔ بات سے بات نکل کر طوالت نہ پیدا ہو جائے۔ مرکزی خیال ایک رہے۔ کردار، واقعات اور مکالمات اسی ایک خیال کو اجاگر کرنے اور تاثر میں شدت پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں ...... یہ بات بھی یہاں پوری طرح واصل ہوگئی ہے کہ کردار صرف ایک ہی ہے۔ (استاد منگو) واقعات اور مکالمات مناظر اور پس منظر کا محور بھی ایک ہے۔ یعنی نئے قانون کے نفاذ کا انتظار۔''

(منٹو: نوری: ناری۔ ممتاز شیریں۔ ص۔124) اشاعت دوم (کراچی سنہ 2004)

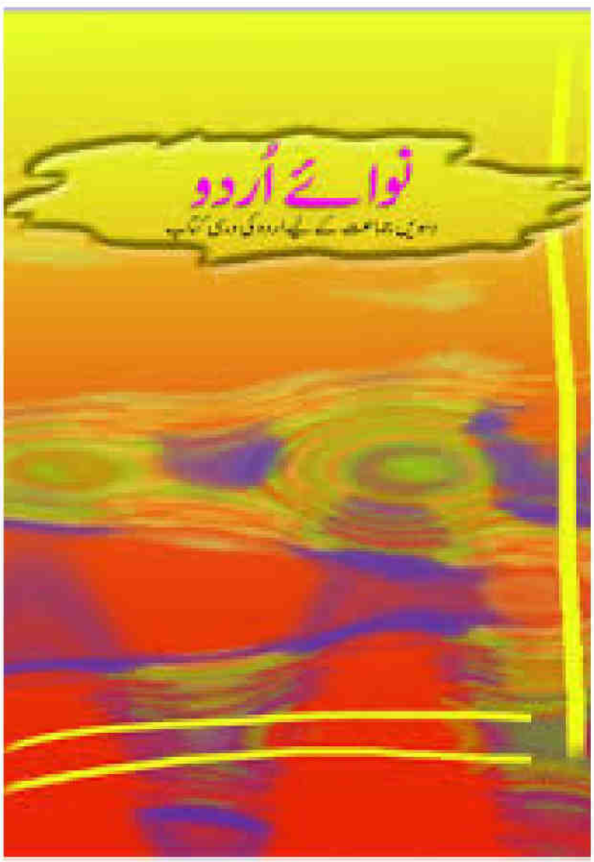


بہرحال یہ کہانی انسانی المیے کی روداد ہے جس میں منٹو نے ان سیدھے اور معصوم لوگوں کی زندگی اور طرز زندگی کو پیش کیا ہے جو سیاسی اور سماجی جبر کے ستائے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں انگریزوں کے مظالم اور ان

حیات اللہ انصاری کا افسانہ ''بھیک'' بھی نصاب میں شامل ہے۔
حیات اللہ انصاری کی شہرت ان کے ناول ''لہو کے پھول'' سے ہے جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مگر ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے اور جدیدیت کے تعلق سے ان کی کتاب ''جدیدیت کی سیر'' ان کی اہم کتابیں ہیں جسے ادبی دنیا میں احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ جہاں تک افسانہ'' بھیک'' کا تعلق ہے تو یہ کہانی غربت میں زندگی بسر کررہے کچھ بچوں کی کہانی ہے۔ رجنی اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ رجنی بارہ برس کی ایک غریب اور یتیم لڑکی ہے، جس کے سر پر چھوٹے بھائی بہنوں کا بوجھ بھی ہے۔ وہ کسی طرح بھیک اور چھوٹے موٹے کام کرکے جیسے تیسے زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی کہ اچانک ایک دن اس کی ملاقات کیلاش نام کے آدمی سے ہوتی ہے جو رجنی کی مجبوری پر رحم کھا کر اسے اور اس کے بھائی کو اپنے گھر رکھنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ کیلاش اور رجنی کے درمیان کی گفتگو دیکھیے:

''کہاں رہتی ہو؟''
لڑکی نے نیچے کی گھنی تاریکیوں کی طرف اشارہ کرکے کہا۔
''وہاں بہت نیچے۔''
''ماں باپ کیا کرتے ہیں؟''
''مر گئے۔''
''تم کیا کرتی ہو؟''
''کچھ نہیں۔''
''کیوں؟''
''بچہ کچھ نہیں کرنے دیتا۔''
''بچہ۔ کیا تمہارے بچہ بھی ہے؟''
لڑکی اس بدگمانی پر ہنس پڑی اور کہنے لگی۔
''میرا دو برس کا بھائی ہے جو بہت دق کرتا ہے۔ ہر وقت کھانا مانگتا ہے۔ رات کو نہ وہ سونے دیتا ہے اور نہ ڈر۔۔۔''
ڈر! اس وادی میں کس چیز سے؟''
''میری کٹھریا کا دروازہ ٹوٹا ہوا ہے۔ رات بھر میں ڈرتی رہتی ہوں کہ کوئی آکر ہم کو کھا نہ جائے۔''
کیلاش کے دل میں دیا ابل پڑی۔
''نوکری کرے گی؟''
''کوئی رکھے تو کیوں نہ کروں۔ میں تو بہت محنت سے اس کی سیوا کروں گی۔''
''اچھا میں رکھوں گا تجھے بھی اور تیرے چھوٹے بھائی کو بھی۔''
لڑکی حیرت زدہ ہوکر کیلاش کو دیکھنے لگی۔
''بابو جی، سچ!''
''ہاں سچ، بالکل سچ۔''
لڑکی تھوڑی دیر تک حیرت زدہ رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ کیلاش کے پاؤں پر گر پڑی۔ اور شکر گزاری سے بابو جی بابو جی کرنے لگی۔ اس کے منہ سے اور کچھ نہ نکلا۔''

کیلاش کی نوکری کا آفر رجنی کو نہ صرف قبول تھا بلکہ دیکھا جائے تو یہ اس کی سب سے بڑی خوشی کا ذریعہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب ان کی بھوک پیاس کا مسئلہ تو حل ہوگا ہی کیلاش اسے کھانے کے ساتھ کپڑے اور دیگر ضرورت کی چیزیں بھی دے گا مگر جب وہ دوسرے دن کیلاش کے گھر اپنے پانچ بھائی بہنوں کے ساتھ آتی ہے تو کیلاش ان سب کو دیکھ کر حیران ہوجاتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ ان پانچ بچوں کی پرورش وہ نہیں کر پائے گا اور یہی سوچ کر وہ رجنی کو دو روپے دے کر رخصت کر دیتا ہے۔ رجنی ان پیسوں سے پوریاں خریدتی ہے اور اپنے بھائی بہنوں کو کھلاتی ہے اور پھر شام میں اپنے گھر لوٹ آتی ہے۔ گویا جس امید کے ساتھ صبح وہ کیلاش کے پاس آئی تھی اب اپنی لاچاری اور غربت کے ساتھ وہ واپس اپنے گھر لوٹ جاتی ہے، وہیں جہاں دروازہ ٹوٹا ہوا تھا اور اسے روز رات میں اس بات کا خوف رہتا کہ رات میں کہیں کوئی جانور آکر انھیں کھا نہ جائے۔

غریبی اور بھوک ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے دنیا کی بڑی آبادی متاثر ہے۔ ایسے میں ہماری کیا ذمہ داری ہے ہمیں اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کہانی میں واضح طور پر تو کچھ نہیں کہا گیا ہے مگر بین السطور میں یہ پیغام ضرور پوشیدہ ہے کہ ہمیں اپنے اردگرد موجود غریب لوگوں کی زندگی کے بارے میں غور وفکر کرنا چاہیے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ این سی ای آر ٹی کے نصاب میں شامل افسانوں کا بنیادی تعلق انسانی زندگی اور اس کے درپیش مسائل سے ہے۔ مذکورہ تمام افسانوں کو پڑھ کر یہی تاثر ابھرتا ہے کہ ان کے ذریعے کہانی کاروں نے معاشرے میں پھیلے عدم مساوات کو موضوع بنایا ہے۔ ان کہانیوں میں عام انسان کی زندگی اور ان کے بہت سے مسائل کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ □□□

Mehreen Qadir Hossen Ali Jan
Hermitage Road, Camp Fouquereaux
Phoenix, Mauritius, Indian Ocen

ڈاکٹر سرفراز جاوید

# ارضِ محبت کی سفیر: نگار بانو ناز

اردو زبان وادب کے فروغ میں خواتین کی خاطر خواہ نمائندگی رہی ہے۔ہاں مردوں کے بالمقابل اردو میں بھی دیگر زبان وادب کی طرح کم ضرور ہے۔اردو میں قابل توجہ شاعرات میں بانو وفا، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، رفیعہ شبنم عابدی، نسیم نیازی اور مسعود حیا تو غیرہ اہم شاعرات ہیں۔نگار بانو ناز کا مقام مذکورہ شاعرات کی صف میں تو نہیں رکھا جاسکتا ہےلیکن ان کی غزلوں میں محبت والفت کی زیریں لہریں بڑی تیز رو کے ساتھ رواں دواں ہیں۔جن میں فکر انسانی کی رفاقت کے جذبہ واحساس کا پرتو غزلیہ کلام کے بین السطور میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ناز کا غزلیہ لہجہ مشرقی تہذیبی روایت کا عکاس ہے۔ان کے یہاں اپنے محبوب کے لیے خودسپردگی اور آداب واخلاق کی پاسداری موجود ہے۔عصر حاضر میں دنیاوی سطح پر خواتین نے اپنی خودمختاری کا اعلان ضرور کیا ہے مگر انسانی اقدار سے بغاوت نہیں کی۔ بیشتر خواتین نے معاشرتی طرز زندگی میں خود کو اخلاقی رشتوں سے وابستہ رکھا ہے۔کیونکہ ہنوز وہ ماں، بہن، بیٹی، بیوی اور محبوبہ کے روپ میں اپنے فرائض کی ذمہ داری کے احساس سے معمور نظر آتی ہے۔

اردو زبان وادب میں چند خواتین نے نہ صرف اپنا لوہا منوایا ہے بلکہ انھوں نے اعلیٰ ادبی فن پارے تخلیق کیے ہیں۔جس کی وجہ سے عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض ۔ وغیرہ تعلیمی نصاب کے لیے ناگزیر بھی بن گئیں۔مزید یہ کہ عصر حاضر میں خواتین محفل افسانہ اور مشاعروں میں بھی اپنی نمائندگی کا بھرپور احساس کرا رہی ہیں۔کیونکہ چند شاعرات نے اپنے صوتی لب ولہجہ سے انسانی سماعتوں پر جادوئی اثر کیا ہے۔ہاں ایسی شاعرات بھی ہیں جو فن شعر سے واقفیت کے ساتھ فکر وخیال کو بھی اپنے کلام میں بحسن خوبی ڈھال رہی ہیں۔ایسی شاعرات میں ایک ابھرتا ہوا نام نگار بانو ناز کا ہے۔ان کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ معاشرہ میں ایک باعزت خاتون کی حیثیت سے شناخت قائم کرنا چاہتی ہیں۔وہ کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں سے محبت کرنا اپنا مقصد حیات سمجھتی ہیں۔

نگار بانو ناز کا 'دسترس' مجموعہ کلام کمیت کے اعتبار سے 71 غزلوں، 2 نظموں اور 2 قطعات پر مشتمل ہے۔ہاں غزلوں کی کیفیت قاری کو حظ عطا کرتی ہیں۔ان کے غزلیہ کلام میں حزن ونشاط اور رومان کے مختلف

پہلو موجود ہیں۔ان کے کلام کا نسائی طرزِ حسن قارئین کو ایک خاص کیفیت سے دوچار کرتا ہے؛

دیکھ کر تیری بے نیازی کو
عاشقی آب آب ہوتی ہے
ہم سے کب تک رہیں گے برگشتہ
بے رخی کیوں جناب ہوتی ہے

ہر تمنا غزل کی صورت میں
تیرے نام انتساب ہوتی ہے

اردو شاعری میں خواتین نے فکر و تخیل کی حسیت کے بالمقابل اپنے وجود اور نفسیاتی کشمکش پر زور صرف کیا ہے۔یہی وجہ ہے ان کے یہاں داخلی طور پر جذباتی کیفیت کی عکاسی ملتی ہے۔ناز نے اردو میں خواتین شاعری کو ایک نئی توانائی سے روبرو کرایا ہے۔وہ اپنے مدمقابل مرد سے استفساری لب ولہجہ میں گویا ہوتی ہیں؛

تیرے خلوص کو چاہت کا نام کیسے دوں؟
خموشیوں کو محبت کا نام کیسے دوں؟

دنیا کے ہر معاشرے میں غالباً طبقاتی کشمکش پائی جاتی ہے اس سے ہندوستان بھی اچھوتا نہیں ہے۔نگار بانو ناز بھی اپنی معاشرتی زندگی میں طبقاتی طور پر انسانوں کے ساتھ غیر مساویانہ رویہ سے دکھی ہیں۔وہ زندگی میں محبت کی کامرانیوں اور ناکامیوں میں مجبور محض جان سے چھٹکارے کی تمنا اور غم جاناں میں چہرے کی پہچان کھونے کا خطرہ محسوس کرتی ہیں تو اپنے احساسات کو شعری پیکر میں سادگی سے ڈھال دیتی ہیں؛

اتنے بھی محبت کے مجھے غم نہ عطا کر
چہرے کی جو پہچان ہے پہچان سے جائے

شاعرہ نے مجازی عشق میں غم جاناں کے باعث دل کی حویلی کو ویرانی کا میدان بنالیا ہے۔اگر اب کسی محبوب کی آمد اس ویران حویلی میں مہمان کی شکل میں ہوگی تو اس کی اداسی کے دور ہونے کا امکان ہے۔

ویراں ہے بہت دن سے میرے دل کی حویلی
اس گھر کی اداسی کسی مہمان سے جائے

ناز کے کلام میں نسائی جذبہ واحساس کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔وہ کارزارِ محبت میں بھی مشرقی تہذیبی روایت کی خواہاں نظر آتی ہیں۔ان کے یہاں عشقیہ معصوم جذبہ کے ساتھ خیالات کی فراوانی جلوہ گر نظر آتی ہے۔وہ اپنے محبوب کو پانے کی بڑی شدت سے جستجو کرتی ہیں۔مگر کوشش ان کے لیے سراب ثابت ہوتی ہے۔تاہم ملنے کی تمنا کا جذبہ ایک انقلابی کیفیت سے دوچار رہتا ہے:

اس کو پانے کی جستجو تھی مری
یہ محض ایک سراب جیسا تھا
اس سے ملنے کی آس باقی تھی
یہ بھی ایک انقلاب جیسا تھا

ناز اپنے محبوب سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں مگر وہ ان کو زخم دل کے سوا کچھ نہیں دیتا تو وہ خود کو ہیر سے تشبیہ دیتی ہیں۔کیونکہ ہندوستانی روایت کی رو سے ہیر بھی اپنے محبوب رانجھے کو پانے میں ناکام رہتی ہے۔شاعرہ کرب کی حالت میں پکار اٹھتی ہے اور یہ پکار ہر اس عورت کی آواز ہے جس نے اپنے محبوب کی تڑپ میں زخم دل کھائے ہیں؛

زخم دل دے گیا آ کر کوئی رانجھا ہم کو
کم نصیبی میں بھی پیچھے نہ رہے ہیر سے ہم

ہمارے تجربہ اور مشاہدہ میں یہ بات ہے کہ کسی شخص کا فطری طور پر نفسیاتی علم اتنا لطیف ہوتا ہے۔کہ وہ اپنے مدمقابل کے چہرے اور گفتگو سے اس کی ذہنی کیفیت کا ادراک کر لیتا ہے۔پھر وہ اس کی مقتضیات کے مطابق اس سے روبرو ہوتے ہیں تو سامنے والا اسے اپنا خیر خواہ محسوس کرنے لگتا ہے۔خاص طور سے ایسی عورتیں اور لڑکیاں جنھیں کسی شخص کی محبت اور سہارے کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔اسی لیے ناز بھی کسی کی محبت آمیز باتوں سے متاثر ہو کر خود کو اس کے سپرد کر دیتی ہیں؛

سوال کرنے سے پہلے جواب دینے لگا
محبتوں کے مجھے وہ گلاب دینے لگا

میں خود کو سونپ نہ دیتی اسے تو کیا کرتی
وہ جگنوؤں کی عوض ماہتاب دینے لگا

نگار بانو کو اپنی محبت کے رومان پر اس قدر اعتماد ہے کہ وہ محبوب کے لیے وثوق کے ساتھ کہہ رہی ہیں کہ ہمیں بھلا کر وہ کبھی سکون حاصل نہیں کر سکتا کہ محبت کے دنوں کی یادیں ان کے دلوں میں ضرور بازگشت کرتی رہیں گی؛

ہمیں بھلا کے کبھی وہ سکوں نہ پائیں گے
انھیں بھی دن یہ محبت کے یاد آئیں گے
گزر گئے ہیں جواب تک تری محبت میں
وہ حادثات بہت ہم کو یاد آئیں گے

اے ناز اسے مجھ سے محبت ہے مگر ہاں
وہ دل سے کسی غم کو لگاتا بھی نہیں ہے

عصر حاضر میں عورت نے اپنے وجود پر توجہ دی ہے۔اور ہر میدان میں اپنا لوہا بھی منوایا ہے ہاں مگر ان کی بڑی قلیل تعداد ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی عورتیں عمومی طور پر چہار دیواری کی قید میں رہ کر اپنے جذبات کی ترجمانی کرتی ہوئی، نہ صرف جھجکتی تھی بلکہ خوف بھی محسوس کرتی تھی۔ مگر ایسی بہت سی شاعرات موجود ہیں۔ جو بہ بانگ دہل بڑے مؤثر انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کررہی ہیں۔ناز محبت میں دلی کیفیت کا اظہار کچھ اس طرح کرتی ہیں؛

دل کہیں کھو گیا ہے الفت میں
جانے کیا ہو گیا ہے الفت میں
زخم دل کے مرے ہرے کر کے
درد بھی دھو گیا ہے الفت میں

درحقیقت دنیا کے ہر سماج میں اس طرح کی شخصیت موجود ہوتی ہیں جو انسانی رویہ کا بڑے قریب سے مشاہدہ کرتی ہیں۔انھوں نے لوگوں کو فریب دیتے اور دھوکا کھاتے دیکھا ہے۔ان کا یہی تجربہ اور مشاہدہ نئی نسل کے لیے پندو نصائح کا کام کرتا ہے۔جو انسان ان کی باتوں کا پاس رکھ اپنی حیات کا عملی شعار بناتا ہے وہ شخص دھوکہ سے محفوظ رہ کر زندگی میں کامیابی کی منزلوں کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔وہ کہتی ہیں کہ مجرب حضرات نے اسے خوب سمجھایا مگر وہ نامانی۔ کیونکہ اس نے فریب میں آ کر محلوں کے خواب سجو لیے تھے جو اسے کبھی میسر نہ آنے والے تھے۔ناز انھیں باتوں کو بڑی سادگی سے الفاظ کے پیکر میں ڈھالتی ہیں:

شاید وہ عمر بھر کبھی میرا نہ ہو سکے
دنیا کے اس بیان میں سچائی بہت تھی
محلوں کے خواب دیکھنا اچھا نہیں تھا ناز
اپنے مکاں کی چھوٹی سی انگنائی بہت تھی

شاعرہ دنیاوی معاملات میں عمومی طور پر محبت کے شیدائیوں کی تباہی و بربادی دیکھتی ہیں تو پکار اٹھتی ہے؛

اے محبت تجھے اللہ سلامت رکھے
تیرے ہاتھوں ہوئے برباد گھرانے کتنے

ناز محبت میں اٹھائے دردالم کا شکوہ بطور تقصیر اپنے رب کے حضور میں پیش کرتی ہیں؛

میرا اتنا قصور ہے یا رب
تیرے بندوں سے پیار کرتی ہوں

وہ جذباتی رومان کے ساتھ سماج کے لوگوں پر اپنے ابھرتے ہوئے غصہ میں عندیہ ظاہر کرتی ہیں؛

اس میں غصے کی بات ہی کیا ہے
پیار آتا ہے پیار کرتی ہوں

ہر مرد و عورت کوئی بھی جب اپنے محبوب کے انتظار میں ہوتے ہیں تو ایک عجیب سی کیفیت کے اضطراب سے دوچار ہوتے ہیں اور جگر میں میٹھا میٹھا سا درد محسوس کرتے ہیں۔ناز اس درد کا شعری پیکر میں کچھ اس طرح اظہار کرتی ہیں؛

میٹھا میٹھا سا درد ہوتا ہے
جب تیرا انتظار کرتی ہوں

دنیا میں بنی نوع انسان کے ساتھ دکھ کا تعلق بقول مہاتما بدھ محبت کے باعث ہے۔عموماً ہر انسان الفت کی وجہ سے ہی غم سے دوچار ہوتا ہے۔یعنی محبت اور غم کا باہم گہرا رشتہ ہے۔لیکن شاعرہ نے یہ بات انوکھے انداز میں کہی ہے کہ مجھے محبت کے وسیلہ سے ستا کر امینِ غم بنایا جارہا ہے؛

محبت میں ستایا جا رہا ہے
امین غم بنایا جا رہا ہے

خالق کائنات نے ہر انسان کی فطرت وسرشت میں کوئی خاص میلان ودیعت کیا ہے۔کسی شخص میں اسی میلان کے سبب ایسی خوبی پیدا ہوجاتی ہے جو وہ دوسروں کو اپنا گرویدہ ،حتیٰ کہ ان کو بے دام اسیر کرلیتی ہے۔ناز بھی اپنے محبوب کے ہرجائی پن کے باوجود بے دام اسیر ہو کر چھٹکارا حاصل نہیں کرپاتی ہے؛

کرتی ہوں اگر حوصلۂ ترک محبت
آتی ہے مجھے اس بتِ کافر کی ادا یاد

تا عمر ہی اے ناز مجھے یاد رہیں گے
اس پیکر محبوب کے انداز وادایاد

کسی بھی معاشرے میں شاعر عام انسانوں کے بالمقابل حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔وہ اپنے معاشرے کے انسانوں کے حرکات وسکنات کی اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی رو سے ان کی نفسیات کا اظہار کرتا ہے۔مزید وہ معاشرے کی چیزوں اور واقعات پر گہری نظر رکھتا ہے۔وہ اپنے کلام میں وقوع پذیر حالات کی تصویر کشی بلاواسطہ یا بالواسطہ الفاظ کے

درحقیقت بیشتر شاعرات فکر کی گہرائی میں خاطر خواہ نہیں اتریں۔ کیونکہ وہ عمومی طور پر ظاہر بینی اور محبوب کو پانے کی تمنا تک اپنی فکر کو محدود رکھ پاتی ہیں۔ وہ محبت کی یادوں کو خواب کی شکل میں سینے سے لگائے رکھتی ہیں۔ وہ بظاہر محبوب کی الفت کی علامت گلاب کو بھی بڑی حفاظت سے رکھتی ہیں؛

مدت کے بعد آ کے ملا پھر تپاک سے
اچھا کیا تھا اس کو کہانی میں چھوڑ کر

دنیا میں اس طرح کے انسان خال خال نظر آتے ہیں کہ وہ اپنے محبوب کو دل میں بسائے رکھتے ہیں وہ اس راز کو کسی پر آشکار بھی نہیں ہونے دیتے۔ خاص طور سے عورتیں ایسے راز کو اپنے سینے میں مدفون رکھتی ہیں۔ نگار نے ایسی دوشیزاؤں اور خواتین کے عشقیہ درد کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالنے کی خوب سعی کی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے محبوب کی خاطر لکھے گئے اشعار دوسروں کو سنا رہی ہیں؛

کسی کے وعدۂ فردہ کو آزماتی رہی
تمام عمر محبت کے غم چھپاتی رہی
غزل کے شعر جو لکھے تھے ناز اس کے لیے
غزل کے شعر کسی اور کو سناتی رہی

انسان کی زندگی میں مشیت یزدی کے مطابق کوئی ایسی شخصیت آتی ہے۔ جس کے تاثرات اس کے دل و دماغ میں اس قدر سرایت کر جاتے ہیں۔ وہ اس کی شخصیت کے اوصاف میں گم ہو کر اس کو پانے کے لیے ہمہ دم کوشاں رہتا ہے۔ یہ حادثہ ناز سے یہ شعر کہلواتا ہے؛

میں ناز اس کے تصور میں اس قدر گم ہوں
کہ جیسے پھر اسے پانے کی ایک لگن سی ہے

ناز اپنے محبوب میں جہاں خلوص و شائستگی کا پہلو دیکھتی ہیں تو دوسری جانب یہ شکایت بھی کرتی ہیں کہ عمومی طور پر محبوب تڑپنے کے درد کو محسوس ہی نہیں کرتا، کیونکہ وہ کبھی اس قدر بے رخی سے پیش آتا ہے؛

بڑے خلوص سے شائستگی سے ملتا ہے
وہ جب بھی ملتا ہے مجھ سے خوشی سے ملتا ہے

ناز نے کسی شخص کو محبت کا سفیر کہہ کر ایک نئی بات پیدا کرنے کی مستحسن سعی کی ہے۔ مزید اس کے تعلق سے اس حسن ظن کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ شعر سناتے وقت میر معلوم ہوتا ہے؛

محبتوں کی زمیں کا سفیر لگتا تھا
وہ جب بھی شعر سناتا تو میر لگتا تھا

ابن آدم کے مزاج میں یہ بات جاگزیں ہے کہ وہ اپنے محبوب یا دوست سے یہ توقع ضرور رکھتا ہے کہ وہ بھی میری طرح مجھ سے محبت و وفاداری رکھے۔ ناز بھی اپنے محبوب سے محبت اور یادآوری کے خیال میں یہ توقع رکھتی ہیں؛

کبھی تو ہو اسے میری محبتوں کا خیال
کبھی تو ہو کہ اسے کھل کے یاد آؤں میں

ناز ایک ایسی شاعرہ ہیں جس نے الفت و وفا کے دوران سفر محبت میں ڈوب جانے کا بھنور دیکھا۔ اور محبت کا ایسا شجر بھی دیکھا، جس پر پھول نہ پتے، حتیٰ کہ وہاں پر پرندوں کا چہچہانا بھی سنائی نہیں دیتا۔ تاہم شاعرہ کو اس بات کا یقین کامل ہے کہ محبت کے نقش نہیں مٹنے والے ہیں۔

نہ کہیں پھول نہ پتے نہ پرندوں کی صدا
ہم نے کل رات محبت کا شجر دیکھا تھا

ناز کے غزلیہ کلام میں عورتوں کی محبت اور غم کی اجتماعی صورت حال کا عکس ان کی انفرادی شخصیت میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ ایک عورت اپنے محبوب کے شب انتظار میں دیے جلا کر وعدۂ فردا کو آزمانے پر آمادہ ہے۔ ناز محبت کی خاطر پتھر پھینکنے والے کے ہاتھ میں بھی پھول پیش کرنے کی خواہشمند ہیں۔ وہ اپنے محبوب کے غم کو اپنی زندگی کا مقصد حیات سمجھتی ہیں۔ آخر وہ محبوب کے لیے تاریک راتوں میں لہو پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کرتی؛

اندھیری رات میں دوں گی لہو چراغوں کو
تمھاری بزم میں اتنا تو کام آؤں گی

دنیا میں جب کسی انسان کو مجازی یا مادی عشق کی بدولت اپنے محبوب سے حد درجہ پیار ہو جاتا ہے۔ تو اس کی ہر چیز لائق احترام اور لگاؤ کا باعث بن جاتی ہے۔ عاشق کے لیے وہ وقت مزید اذیت کا سبب ہوتا ہے کہ جس کی خاطر دیوانگی کی انتہا سے دوچار ہوا ہے، وہ بھی اس پر پتھر اٹھاتا ہے۔ ناز اس مشاہداتی کیفیت کو شعری پیکر میں کچھ اس طرح پیش کرتی ہیں؛

میں تو دیوانی ہوئی جس کے سبب اس نے بھی
ساری دنیا کی طرح مجھ پہ اٹھائے پتھر

ناز نے محبت کے تجربہ سے گزر کر کیا خوب غم نوازی کا سلیقہ سیکھا ہے؛

ہمیں بھی ناز سلیقہ تھا غمنوازی کا
جنون عشق ہمارے بھی سر سے گزرا ہے

شاعرہ کو اپنے محبوب کے رویہ سے یہ احساس کامل ہوا ہے کہ وہ ضرور مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مگر وہ غم الفت کو دل پر نہیں لیتا؛

ذریعہ پیش کردیتا ہے۔ناز کے چند اشعار پر غور کیجیے؛

دوست کے دشمن سے ملنا بار بار
دوست کو دشمن بنانا ہو گیا
آج وہ شدت سے یاد آیا ہمیں
جس کو بھولے ایک زمانہ ہو گیا

دنیا کے کسی بھی خطہ کے ہر معاشرے میں شریف لوگ پائے جاتے ہیں۔ان کو اپنے تہذیبی اقدار کا جان عزیز سے زیادہ پاس ہوتا ہے۔وہ اپنی اقدار کی حتیٰ المقدور حفاظت کرتے ہیں۔وہ غیر شائستہ الفاظ اپنی نوک زبان پر لانا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔اسی لیے ناز غیر مہذب محبوب کی ترک محبت پر شکایت نہیں کرتی؛

آپ سے ترک محبت کی شکایت بھی نہیں
آپ تو واقف آداب محبت بھی نہیں

شاعرہ بھی ایک انسان ہے جو محبت کی سفیر ہونے کے باوجود کسی ایسے شناسا سے، جو بھول کا مرتکب ہوا ہے، بڑی تلخ نوائی سے پیش آتی ہیں ۔کیونکہ وہ آداب محبت میں سمجھوتے کی قائل نہیں ہیں؛

کبھی یہ سوچنا اے بھولنے والے تیری
نگاہ ناز میں توقیر وآبرو کیا ہے

دنیاوی تجربہ ومشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ جب تک عمومی طور پر کوئی شخص پیش نگاہ رہتا ہے تب تک ہی وہ منظور نظر رہتا ہے۔یعنی اس سے محبت وانس بھی قائم رہتا ہے۔جیسے ہی وہ دور ہوا تو اس سے ہمدردی والفت میں فطری طور پر کمی واقع ہوجاتی ہے۔شاعرہ مضمون کو اس طرح پیش کرتی ہیں؛

بہت دنوں سے تیری یاد بھی نہیں آئی
بہت دنوں سے جگر میں ہے درد بھی کم کم

ابن آدم کے فکر وتخیل میں محبت کا ایک ایسا لطیف راز ہے، جس کو گرفت میں لانا ممکن نہیں۔یہ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے، جس کے تاثرات انسان کے چہرہ اور عمل میں ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔اسی لیے ناز راہ الفت میں بچھڑ جانے والوں پر افسوس کا اظہار کرتی ہیں کیونکہ وہ ڈھونڈنے کے باوجود کارواں تک رسائی نہیں پاتے؛

بچھڑنے والوں پہ افسوس، راہ الفت میں
وہ ڈھونڈتے ہیں مگر کارواں نہیں ملتا

ہر انسان کی فطرت میں کم زیادہ ہمدردی ومحبت کا جذبہ ودیعت کیا گیا ہے۔مگر دوسری طرف اس میں نفرت وظلم کی خو بھی رکھی ہے جس کے باعث وہ ظلم وزیادتی کا مرتکب بھی ہوتا رہتا ہے۔عموماً ایسا معاملہ محبت کے نفرت میں بدل جانے پر پیش آتا ہے اور انسان ایسی حالت میں دوسرے انسان کے تحائف بھی واپس کردیتا ہے مگر عاشق ان سب کے باوجود اپنے محبوب کو پانے کی تمنا کرتا ہے؛

وفا کا عہد کرکے عہد توڑا کون کرتا ہے
کیا تم نے جو الفت میں تو ایسا کون کرتا ہے
یہ کس نے آج بھیجے ہیں مرے خط میری تصویریں
یہ مجھ سے ترک الفت کا تقاضا کون کرتا ہے

ناز اپنے محبوب کی آمد کا استقبال کس والہانہ انداز میں کرتی ہیں؛

فضا بہکی بہکی چمن روح پرور، بہت دل نشیں ہے محبت کا منظر
ذرا یہ بتا دو کہ کب آرہے ہو بہار چمن یاد فرما رہی ہے

دراصل ناز نے ہندوستانی عورتوں کے عشق ومحبت کی نفسیات کو ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی رو سے اپنے سخن کا حصہ بنا دیا ہے۔وہ محبوب کی عقیدت میں کس حد تک سراپا نیاز نظر آتی ہیں ان کے اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے؛

کبھی شام غزل سناؤں گی کبھی شام کو بزم سجاؤں گی
تو دیا ہے میرے نصیب کا جسے عمر بھر میں جلاؤں گی

تو ہزار مجھ سے خفا رہے میں ہزار تجھ سے جدا رہا ہوں
تیرے آستاں کا چراغ ہوں کبھی دور تجھ سے نہ جاؤں گی

ناز کے مجموعۂ کلام 'دسترس' کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعرہ نے محبت کے لطیف جذبات کو شعری پیکر میں ڈھالنے کی بھرپور کوشش کی ہے، جس میں وہ کافی حد تک سامعین کے دلوں کو چھونے میں کامیاب ہوئی ہیں۔انھوں نے عشقیہ جذبات کی رو میں ہجر ووصال، محبت ونفرت اور ایثار وہرجائی کے موضوعات کو بھی اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ان کا یہ ذاتی کرب ان تمام عورتوں کا درد والم بن جاتا ہے جو پیار ومحبت کے نشیب وفراز سے دوچار ہوئی ہیں۔ناز کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ان کے کلام میں محبت کا پہلو حاوی ہے اسی لیے وہ ارض محبت کی سفیر ہیں۔

□□□

**Dr. Sarfaraz Javed**
R-155,Gali no- 6, Sir syed Road
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025

ڈاکٹر شہاب افسر خان

# رخشندہ روحی کی خوشبو کہانیاں

رخشندہ روحی سے میری پہلی سرسری سی ملاقات ریاض (سعودی عرب) کے ہوٹل 'المطلق' میں اس وقت ہوئی تھی جبکہ انڈین کلب ریاض نے مشہور فلم ایکٹر شتروگھن سنہا کو ہندوستان سے پرفارم کرنے کے لیے بلایا تھا۔ ہندوستانی سفارتخانے کی مدد سے ایک ''شام شتروگھن سنہا کے نام'' منعقد ہوئی تھی۔ پانچ ستارہ ہوٹل میں شاندار ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جب شتروگھن سنہا اسٹیج پر پرفارم کر رہے تھے تو سامنے والی سیٹوں کے آگے ایک چنچل سی دوشیزہ شتروگھن سنہا سے آٹوگراف لینے کے لیے کھڑی تھی۔

زندگی سے بھرپور، ذہین آنکھوں والی کم سن لڑکی سے اس پروگرام میں گفتگو کا موقع نہیں ملا لیکن کچھ عرصے کے بعد انہیں اپنے اسکول میں ٹیچرس کے انٹرویو کی قطار میں بیٹھے انتظار کرتے دیکھ کر تعجب ضرور ہوا اور انٹرویو کے دوران معلوم ہوا کہ یہ رخشندہ روحی ہیں۔

ان کی قابلیت کے لحاظ سے ان کو انٹرنیشنل انڈین اسکول ریاض میں ہندی پڑھانے کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ وہ جس محنت لگن اور محبت سے کلاس میں پڑھاتی تھیں اس سے بچوں کے ذہنوں میں اور اسکول میں ان کی الگ پہچان بن گئی۔ پڑھائی کے ساتھ رخشندہ روحی اسکول کی کلچرل اور اکیڈمک سرگرمیوں میں بھی اپنی بہترین کارکردگی اور فنی اہلیت سے ہم سب کو روشناس کراتی رہیں۔

ریاض چھوڑنے کے بعد رخشندہ کہیں گم ہوگئی اور ایک طویل عرصہ بعد حال ہی میں فیس بک کے ذریعہ پھر ان سے رابطہ ہوا لیکن اس بار ایک بہترین فنکار اور ایک معروف افسانہ نگار کی حیثیت سے میں ان کی تخلیقات سے روبرو تھا۔

دیوبند جیسے مشہور ہندوستانی شہر (جہاں دارالعلوم دیوبند ہے) میں معروف شاعر عقیل مہدی (محزوں نیازی) مرحوم اور خورشید طلعت کے گھر جنمی رخشندہ روحی کو ورثہ میں تعلیمی گھرانہ ملا۔ تایہ جمیل مہدی انقلابی قلمکار و معروف اخبارات 'عزائم' اور 'مرکز' لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔ رخشندہ نے تین سال کی عمر سے ہی اسکول جانا شروع کیا اور اردو اپنے والد سے گھر ہی میں سیکھی کیونکہ ان کے اسکول میں ابتدائی اردو چھٹی جماعت سے آٹھویں جماعت تک پڑھائی جاتی تھی۔ ایک تہذیبی روایتی گھرانے میں روحی کی پرورش ہوئی جہاں اردو کے رسالے 'شمع' کم سن بچوں کو پڑھنا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن دوسرے رسائل کے ساتھ رخشندہ چوری چھپے 'شمع' پڑھ لیا کرتی تھیں۔ جب وہ سات سال کی تھیں ان کے والد انتقال

کر گئے۔ پرورش والدہ محترمہ نے کی۔اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ علی گڈھ ہوسٹل چلی گئیں اور اکیلے پن کا احساس ساتھ لے گئیں۔کم عمری میں رشتہ ازدواج میں بندھیں اور گھر گرہستی میں ایسی مصروف ہوئیں کہ لکھنے لکھانے کا ہوش ہی نہ رہا۔عمر کے تیسرے دہے میں روحی کے اندر کا فنکار ایسے جاگا کہ پھر کبھی مڑ کر نہیں دیکھا۔اپنی زندگی کے ذاتی تجربات اور صنف نازک کے گھٹے گھٹے رہنے کا احساس ان کے ذہن کے گوشے میں لاشعوری کے زمانے سے جمع ہو رہا تھا جو دبی لاوا بن کر ان کے ذہن و دل کو متاثر کرنے لگا۔آخر کار وہ جوالا مکھی بن کر پھٹا اور انھوں نے اس لاوے کو بڑی ہی خوبصورتی سے اپنی کہانیوں میں اتارا جس کا آج اردو ادب قائل ہے۔ان کی تین درجن سے زیادہ اردو ہندی کہانیاں ابھی تک مختلف ہندوستانی اور بین الاقوامی رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

مسلم گھرانے میں جنمی روحی اردو پر تو اپنی دسترس درج کراتی ہیں لیکن انھوں نے پی ایچ ڈی ہندی میں کی ہے۔بی ایڈ میں انگریزی ٹیچنگ سبجکٹ ہے اور اسکول میں آج بھی پڑھاتی ہندی ہیں۔تین مختلف زبانوں کا سنگم رخشندہ روحی کی تخلیقات میں جا بجا اجاگر ہے۔اردو کے ساتھ ہندی ادب میں ان کی مخصوص پہچان ہے۔

رخشندہ روحی مہدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''مگر اک شاخ نہال غم۔۔۔'' منظر عام پر آیا اور ادبی حلقوں میں کافی بہت پسند کیا گیا ہے۔ زیر بحث کتاب کا دیباچہ جناب رتن سنگھ نے لکھا ہے۔اس افسانوی مجموعے میں 'رخشندہ روحی ایک ہونہار قلم کار۔۔' کے عنوان سے محترمہ بانو سرتاج کے الفاظ درج ہیں:

''رخشندہ روحی اور اظہار ذات۔۔'' میں محترمہ صبیحہ انور نے اپنے خیالات قلمبند کیے ہیں اور ''اپنی بات'' میں رخشندہ روحی اپنا مختصر تعارف کراتی ہیں۔

اس کتاب میں ان کے 13 افسانے شامل ہیں اور سب ہی افسانے اردو کے نامور رسالوں جیسے آجکل، ایوان اردو، چہار سو (پاکستان)، بیسویں صدی' ادب ساز ، نیا دور اور خواتین دنیا، انشاء وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔اس کتاب کی اس خاص بات نے مجھے متوجہ کیا کہ سب ہی افسانوں کے نام کسی نہ کسی شعر کا پہلا یا دوسرا مصرع ہیں۔یہ افسانہ نگار کے شاعرانہ مزاج کا عکاس ہے کہ اس کتاب کا ٹائٹل سراج اورنگ آبادی کے اس شعر سے لیا گیا ہے:

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

سرزمین اورنگ آباد کو اردو ادب کو مایہ ناز شاعر اور ادیب اور نقاد دینے کا شرف حاصل ہے۔اور مجھے فخر ہے کہ اورنگ آباد میرا وطن ہے۔

میری نظر میں ان سب افسانوں میں ''مگر اک شاخ نہال غم'' سب سے منفرد اور خوبصورت افسانہ ہے جو رخشندہ کے افسانوں میں کوہ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔اس افسانے کی مقبولیت کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اسے پنجابی اور کنڑ زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا ہے۔

رخشندہ روحی کے اس افسانوی مجموعہ میں مختلف قسم کی کہانیاں ملتی ہیں جو کبھی گاؤں کی زندگی اور وہاں کے ماحول سے روشناس کراتی ہیں تو کبھی عربستان کی دھدکتی ریت کی تپش میں لے جاتی ہیں۔ چھوٹی سی پگڈنڈی جس کے اطراف جھاڑیاں اور سوکھے پتوں پر چلنے کی چرمراہٹ روحی کے افسانوں میں سنائی دیتی ہے تو کبھی گل مہر کے پھولوں کی رنگت گہرے سرخ تو کبھی موقع کی نزاکت کو دیکھ کر بے رنگ ہوتی نظر آتی ہے۔

پانی میں پتھر پھینک کر دائرے بنا کر اپنی صورت کو بگڑتے دیکھنا اور پھر اسے صاف ہوتے ہوئے دیکھنا، دائرے بڑے کرنا اور بڑے کرنا اور ان کو مٹا دینا' تخیلات کی خوش کن دنیا سے بدرنگ حقیقت کا سامنا ہونے پر ان کے افسانوں کے قاری کو ذہنی انتشار سے دوچار کر دیتا ہے۔

خوشبو سے اپنی کہانی شروع کرنا اسے خوشبو پر آگے بڑھانا اور خوشبو ہی پر اپنی کہانی کو ختم کرنا کوئی روحی سے سیکھے۔

ان کے افسانوں میں صنف نازک ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس کی بے بسی، اس کی گھٹن، اس کی لاچاری اس کی مجبوریاں، اس پر ہونے والے ظلم اور انھیں برداشت کرنے کی صلاحیت کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے قلم بند کیا ہے۔وہ تڑپتی ہیں اور عورتوں کی کتابوں کے بستے چھن جانے پر افسوس ظاہر کرتی ہیں وہ انھیں ادھ ننگا دیکھنا نہیں چاہتیں وہ ان کے جسم کو ڈھانپنا چاہتی ہیں۔وہ ان کی زندگیوں سے غم واندوہ کے اندھیرے مٹا کر پیار و محبت کے پھول بکھیرنا چاہتی ہیں۔وہ مرد کو مضبوط مرد بننے کی بجائے دردمند انسان بننے کی صلاح دیتی ہیں۔

ان کے افسانوں میں ایک خوبرو شہزادہ اس سماج کو برائیوں کو دور کرتا نظر آتا ہے جو پریوں کے دیس میں رہتا ہے اور یہاں کے عوام کی فلاح بہبود کے لیے کام کرنا چاہتا ہے لیکن اس ظالم دنیا کے لوگ اس کے کام میں روڑے اٹکاتے ہیں۔لیکن شہزادہ ہمت نہیں ہارتا اور رعایا کو یقین دلاتا ہے کہ وہ پھر آئے گا اور اس کے آنے کے بعد اچھے دن آئیں گے۔

روحی کے لیے چھپکلی کہانی کا ایک چھوٹا سا کردار بنتی ہے اور کہانی کو نہ صرف آگے بڑھاتی ہے بلکہ دلچسپ بھی بناتی ہے۔چوہے کا بھی وجود

روحی کی کہانیوں میں شامل ہے چوہے کو مارنے میں کہانی کا ہیرو اپنی جواں مردی تصور کرتا ہے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔

کہانی ''بہت سنبھالا وفا کا پیمان مگر'' میں اداس ماحول کو کوئل کی کوک ہلکا اور سریلا بناتی ہے۔ ''قوس قزح نے اپنا خزانہ لٹا دیا'' کہانی میں شاہ جی کے کردار کو اجاگر کرکے روحی نے روحانی معالجوں پر اولاد کی خاطر دیوانوں کی طرح یقین کرنے والوں پر گہرا طنز کسا ہے۔

لمبے لمبے چڑیلوں جیسے بال، گھٹنوں پر لٹکتے ہوئے بال اور چھوٹے کندھوں تک کٹے بال، کمر کے نیچے لٹکتے طبلہ بجاتے بال، لمبی سنہری بل کھاتی چوٹی، براون بال اور شاہ جی جیسے لانبے کندھے پر گرتے بال، اصلی چاندی کے بال، کالے ناگ جیسے زہریلے بال، ادھ جلیں ناہموار بال، انمول لمبی ریشم کا لچھہ چوٹی، سفید مائل ہلکے چھلے دار بال، سفید کم اور کالے زیادہ سٹرٹ سلکی بال، کالے چھلے دار بال، بھی ان کی کہانیوں کا بڑا طلسماتی حصہ ہیں۔

مصنفہ نے اپنے افسانوں میں فلمی گیت اور اشعار کا خوب سہارا لیا ہے جو کہانیوں کو دلچسپ بناتے ہیں۔

ان کی کہانیوں میں آنکھوں کا بڑی شائستگی سے ذکر کیا گیا ہے۔ گہری گہری ذہین آنکھیں، حد سے زیادہ روشن آنکھیں، کھوئی کھوئی آنکھیں، شفاف سفید آنکھیں، تال کے کنول سی بھیگی آنکھیں، بڑی بڑی خاموش اداس آنکھیں، اور جھیل سی نیلی آنکھیں' سنہری آنکھیں' سمندر سی سبز آنکھیں' پڑھتے ہوئے آپ ان کہانیوں کے رومان میں کھو کر رہ جائیں گے۔

□□□

**Dr. Shahab Afsar Khan**
'Afsar Manzil'
4/11/43/766
Roshan Gate, Azam Colony
Aurangabad-431001 (M.S)

**Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"**

## سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................. بتاریخ..................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ..................................................................

پتہ : ..................................................................

..................................................................

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

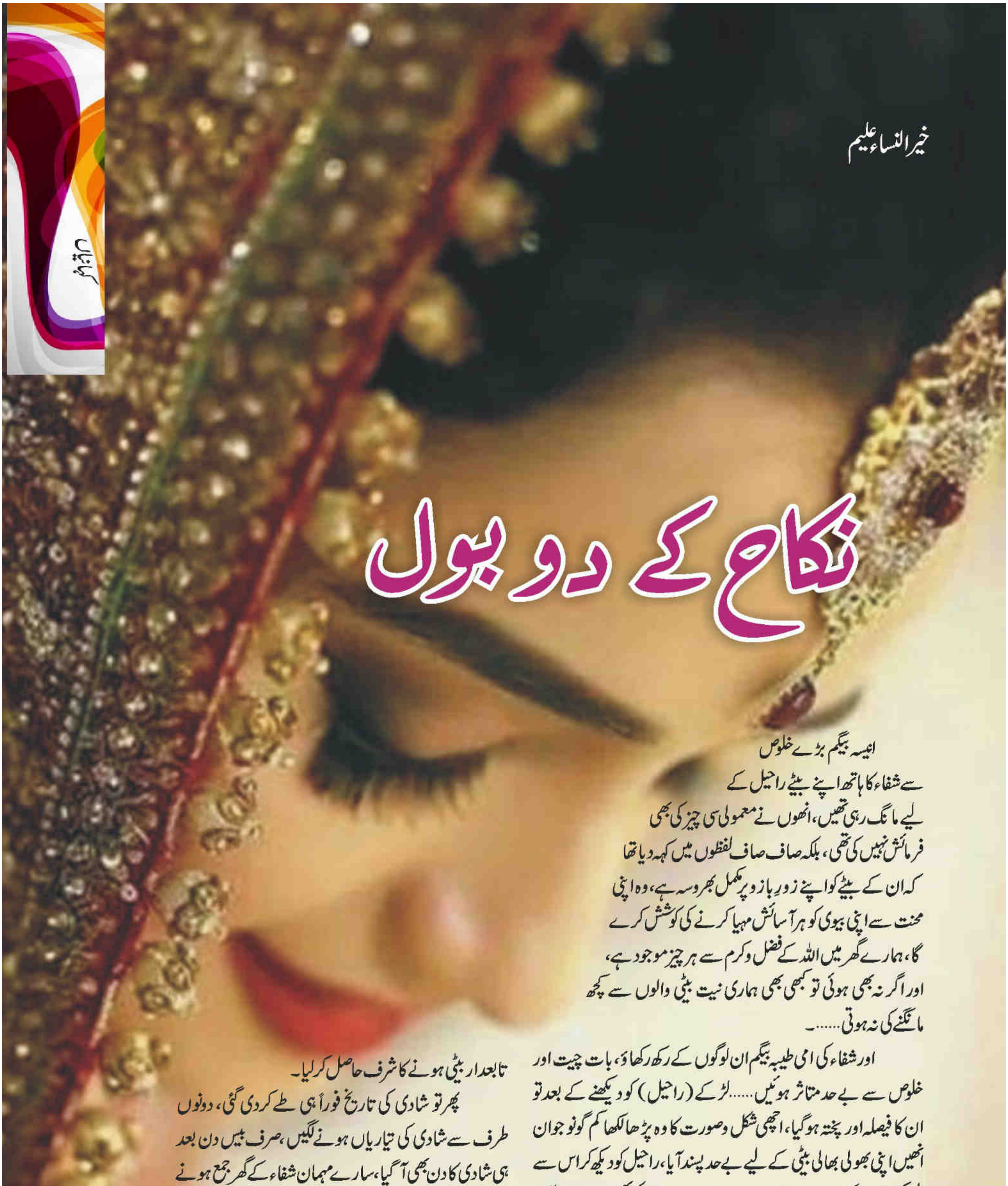

خیر النساء علیم

# نکاح کے دو بول

انیسہ بیگم بڑے خلوص سے شفاء کا ہاتھ اپنے بیٹے راحیل کے لیے مانگ رہی تھیں، انھوں نے معمولی سی چیز کی بھی فرمائش نہیں کی تھی، بلکہ صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ ان کے بیٹے کو اپنے زورِ بازو پر مکمل بھروسہ ہے، وہ اپنی محنت سے اپنی بیوی کو ہر آسائش مہیا کرنے کی کوشش کرے گا، ہمارے گھر میں اللہ کے فضل وکرم سے ہر چیز موجود ہے، اور اگر نہ بھی ہوئی تو کبھی بھی ہماری نیت بیٹی والوں سے کچھ مانگنے کی نہ ہوتی......۔

اور شفاء کی امی طیبہ بیگم ان لوگوں کے رکھ رکھاؤ، بات چیت اور خلوص سے بے حد متاثر ہوئیں......لڑکے (راحیل) کو دیکھنے کے بعد تو ان کا فیصلہ اور پختہ ہوگیا، اچھی شکل وصورت کا وہ پڑھا لکھا کم گو نوجوان انھیں اپنی بھولی بھالی بیٹی کے لیے بے حد پسند آیا، راحیل کو دیکھ کر اس سے مل کر شفاء کے ابا زماں خان، بڑے ماموں اور چچا کو بھی بہت پسند آیا، شفاء کی مرضی معلوم کی تو اس نے امی ابو کے فیصلے کے سامنے سر جھکا کر تابعدار بیٹی ہونے کا شرف حاصل کرلیا۔

پھر تو شادی کی تاریخ فوراً ہی طے کردی گئی، دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں، صرف بیس دن بعد ہی شادی کا دن بھی آگیا، سارے مہمان شفاء کے گھر جمع ہونے لگے، خود اس کے کمرے میں چاروں طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی، اب جلد ہی اس کو اپنا یہ پیارا گھر چھوڑ دینا تھا، جہاں وہ اپنی

پیاری سی چھوٹی بہن اور لاڈلے بھائی کے ساتھ اپنی امی اور ابو کی شفقتیں سمیٹا کرتی تھی، ان خیالات کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے، امی کتنی ہی دیر اُسے پیار سے سمجھاتیں، اس کی خوش نصیبی کا یقین دلاتیں کہ اتنی اچھی سسرال مل رہی ہے، پھر وہ بھی اپنے آنے والے خوبصورت دنوں کے تصور میں کھو جاتی۔

مایوں بٹھایا گیا تو کتنا نور اترآیا تھا اس کے چہرے پر...... گوٹہ کرن لگے پیلے دوپٹے کو اوڑھ کر جب اس نے آئینہ پر نظر ڈالی تو خود کو ہی نہ پہچان پائی۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو آپی!'' چھوٹی بہن اسفا نے پیار سے کہا۔

''واقعی شفاء! بہت اچھی لگ رہی ہو...... تم پر یہ رنگ بہت سوٹ کررہا ہے۔'' بھائی زایان نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک ایک کر کے سب کمرے کے باہر جا چکے، تب سرمد کمرے میں آیا کسی کام سے...... اس نے شفاء کو دیکھا اور وہ یکسر انجان بنی بیٹھی رہی۔

''اچھی لگ رہی ہو اس روپ میں!!'' وہ آہستہ سے بولا تو شفاء نے غصہ سے سر اُٹھایا۔

''تمھیں یہ سب کہنے کا حق نہیں ہے۔''

''تم میری کزن تو ہو ناں...... ! جب سب کہہ سکتے ہیں تو کیا میں اتنا چھوٹا سا حق بھی کھو چکا ہوں......'' اس کی آواز میں دکھ تھا۔

''پلیز سرمد! مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں ہیں...... اور نہ ہی تم۔''

سرمد نے تڑپ کر اسے دیکھا، وہ تو اس کے لیے ہمیشہ یوں ہی سنگدل رہی تھی، اس کی اتنی محبتوں اور خلوص کے باوجود...... وہ اس سے لاتعلق رہنا پسند کرتی تھی...... جانے کیوں؟ وہ پڑھا لکھا تھا، اس کے اپنے خاندان کا تھا، ایک بہت اچھی پوسٹ پر فائز تھا، خاندان کا ہر فرد اس کی خوش مزاجی اور ہمدردی کے گن گاتا تھا، تو بزرگ اطاعت گزاری و فرمانبرداری پر ناز کرتے تھے...... بس کمی تھی تو صرف یہ کہ وہ خوبصورت شخصیت کا مالک نہیں تھا، اور شفاء کا آئیڈیل انتہائی خوبصورت اور دلکش شخصیت تھی......

''جانتا ہوں شفاء اچھی طرح...... !'' وہ فوراً پلٹ گیا۔

خالہ جانی کمرے میں آئیں تو اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

''شفاء بیٹا اٹھو! پارلر جانے کا وقت ہو رہا ہے...... ابھی گیارہ بجے پہنچوگی تو تیاری آسانی سے ہوگی ...... ورنہ دیر ہونے کا خدشہ رہتا ہے......''

شادی کا جوڑا دیکھ کر شفاء کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی، ٹشو کا پلین گوٹہ لگا دوپٹہ اور بنارسی سیاٹن کا غرارہ اور قمیص نہایت ہی معمولی سا تھا۔

اتنا ڈل کلر دولہن کے اوپر کہاں سوٹ کرتا ہے......؟ یہ کیا رنگ اُٹھا لائے یہ لوگ؟ اس نے بددل ہوتے ہوئے سوچا۔

''تمھارے سسرال والے خاصے کم عقل معلوم ہوتے ہیں، دلہنوں کے لیے ایسا رنگ لایا جاتا ہے......؟'' مامی جان نے بہت محبت جتاتے ہوئے افسوس سے کہا۔

''صحیح کہہ رہی ہیں آپ...... آج کل ایسے کپڑوں کا فیشن کہاں......؟'' خالہ جانی نے بھی لقمہ دیا۔

غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہونے لگیں...... شفاء کا موڈ خاصا خراب ہو چکا تھا۔

''ارے! تم سب کیسی باتیں کر رہی ہو......؟ کیا برائی ہے ان کپڑوں میں......''

امی نے سب کو ڈانٹتے ہوئے کہا......

''جیسے ہیں ویسے ہی تو کہیں گی سب بھی......'' شفاء نے آہستہ سے کہا۔

''تم بھی ان معمولی باتوں کو اہمیت دیتی ہو شفاء؟ کپڑے ہی تو ہیں، کل اور بنالینا۔'' چھوٹی بہن اسفا نے سمجھداری سے کہا۔

مگر شفاء کا دل ملول ہو چکا تھا...... اس کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی۔

''شادی اور ولیمے کے جوڑے بار بار نہیں بنتے ناں امی! کم از کم آج کا جوڑا ہی اچھا لیا ہوتا۔ ان کپڑوں میں میں بہت بری لگوں گی......''

''سب چیزیں بہت اچھی ہیں...... سوائے شادی کے جوڑے کے...... اپنی شفاء کا رنگ ویسے بھی ذرا دبتا سا ہے، اس کے لیے شاکنگ پنک یا ریڈ صحیح رہتا......'' چچی جان نے بھی افسوس ظاہر کیا۔

''اب اتنا برا بھی نہیں ہے طاہرہ! ...... کم از کم تم تو اس کا دل رکھنے والی بات کہو۔'' امی نے بہت ملال سے کہا۔

خالہ جانی پوری طرح شفاء کے حق میں تھیں، انھیں اپنی پیاری بھانجی کی اداس صورت اچھی نہیں لگ رہی تھی، انھوں نے رائے دی کہ کیوں نہ ہم آج کا جوڑا شفاء کی پسند کا لے لیں۔

''نہیں!......نہیں...... نجمہ!! سسرال کا جوڑا نہ پہنایا گیا تو کہیں وہ لوگ برا نہ مان جائیں، اگر ایسا ہی ہے تو پہلے ان سے پوچھ لیتے ہیں......''
امی نے کچھ سوچتے ہوئے شفاء کو دیکھا۔
''نہیں آپا! اگر انھوں نے منع کر دیا تو ہم ایسا نہیں کر سکیں گے۔''
سب لوگوں نے نجمہ کے اندیشوں کی تائید کی۔
پھر ابو کو بھی راضی کر لیا گیا...... یوں پارلر جاتے ہوئے خالہ جانی نے اسے اس کی پسند کا خوبصورت کام والا پنک سوٹ دلا دیا...... جب وہ تیار ہو کر پارلر سے آئی تو اس کا کھلا کھلا خوبصورت چہرہ دیکھ کر امی قدرے مطمئن ہو گئیں،......شفاء خوش ہے؛ یہ بات ان کے لیے سب سے اہم تھی۔
''سنو بیٹا سرمد! جو چیزیں ہال میں پہنچانا تھی' پہنچا دی ناں؟'' امی کو خیال آیا۔
''جی خالہ جان!! ابھی میں اور رومان پہنچا آئے ہیں۔''
''اچھا پھر اب تم بھی تیار ہو جاؤ!......شفاء، نجمہ اور جو بھی تیار ہوں ان کو شادی ہال پہنچا دو، دولہن کا دیر سے جانا ٹھیک نہیں......''
''جی اچھا خالہ جان! پہلے میں سب کو ہال پہنچا دوں...... پھر خود تیار ہوں گا۔''
تھوڑی ہی دیر میں شفاء اپنی خالہ جانی اور چند کزنز کے ساتھ باہر آ گئی، سرمد نے سنجیدگی سے اس کے لیے دروازہ کھول دیا......اور خود آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
''تم نے آج پہننے کے لیے کیسے کپڑے بنوائے ہیں سرمد؟''
''ہلکے بسکٹ کلر کی شلوار قمیص ہے، واسکوٹ کے ساتھ......''
''اچھا کیا سرمد! سب میں منفرد لگو گے......'' خالہ جانی نے ستائشی لہجے میں کہا۔
''اونہہ! تم کچھ بھی پہن لو!......لگو گے وہی عام سے سرمد ملک شاہ!!'' شفاء نے دل ہی دل میں سوچا۔
شفاء نے اسے یہی سمجھ کر ریجکٹ کیا تھا، وہ اس کے گہرے سانولے رنگ کو ناپسند کرتی تھی، حالانکہ وہ خود بہت زیادہ صاف رنگ کی مالک نہیں تھی۔
شادی ہال کے سامنے گاڑی روک کر اس نے ایک نظر شفاء کو دیکھا اور کہا......
''شفاء! تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو!......اس پہناوے میں تو نظر لگ رہی ہے۔''
''شٹ اَپ سرمد! مجھ سے ایسی چیپ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں......'' اور دندناتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی......سرمد اسے اندر جاتا ہوا دیکھتا رہا اور پھر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''شفاء ہال میں آئی تو سب ہی اس کا یہ انوکھا روپ دیکھ کر حیران رہ گئے...... بہترین میک اپ' شاکنگ پنک کام دار شرارہ سوٹ میں وہ بالکل کسی دیس کی شہزادی لگ رہی تھی، سب لوگ بے حد تعریف کر رہے تھے۔''

شفاء ہال میں آئی تو سب ہی اس کا یہ انوکھا روپ دیکھ کر حیران رہ گئے......بہترین میک اپ' شاکنگ پنک کام دار شرارہ سوٹ میں وہ بالکل کسی دیس کی شہزادی لگ رہی تھی، سب لوگ بے حد تعریف کر رہے تھے۔
''جانے راحیل کب دیکھیں گے میرا یہ روپ......؟'' شفاء کے دل نے کہا، دولہا والوں کی آمد پر سب مصروف ہو گئے۔
''دولہن نے یہ کون سے کپڑے پہنے ہیں......؟'' سب سے پہلے دولہا کی بڑی بہن فاخرہ کی آواز امی کے کان میں آئی۔
''ہاں! یہ ہمارے ہاں کا جوڑا نہیں ہے۔'' یہ دولہا کی چچی تھیں۔
''ہاں! صحیح کہہ رہی ہو......'' شفاء کی ساس بھی حیران ہوئیں۔
''وہ دراصل بات یہ ہے کہ آپ کے ہاں سے آئے ہوئے سوٹ کا کلر کچھ ڈل سا تھا، اس لیے یہ پنک کلر کا سوٹ دولہن کے لیے میں نے خریدا۔'' خالہ جانی نے بات سنبھالی۔
مگر دولہے والوں نے اس بات کو اپنی ہتک کا مسئلہ بنا لیا......
شریک مہمانوں نے بھی کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ جتایا...... بات بڑھتے بڑھتے بہت بڑھ گئی۔
شفاء کی خالہ جانی اور چچی جان نے آگے بڑھ کر ساس کے ہاتھ تھام لیے اور انھیں سمجھانے لگیں...
''تو پھر آپ کو چاہیے کہ آپ ابھی دولہن کا لباس تبدیل کروا دیں۔'' دولہے کی چچی نے کہا۔
''کیا کہہ رہی ہیں آپ......؟'' اب کیسے لباس تبدیل ہوگا؟ وہ تو ہم نے اور سامان کے ساتھ آپ کے گھر شام کو ہی بھجوا دیا ہے......'' امی نے رسانیت سے سمجھانے کی کوشش کی۔
بات خاصی بڑھ گئی تھی...... مردانے میں بھی پتا چل گیا، دولہا و

دولہن کے بزرگ بھی اندر آگئے...... مردوں نے بھی دولہے والوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔

''نہیں جی! اب تو یہی ہماری عزت کا معاملہ ہوگیا...... اس جوڑے میں تو ہم دولہن کو نہیں لے جائیں گے......'' دولہا کے والد فیصلہ کن انداز میں بولے۔

''چھوٹی سی بات کو خواہ مخواہ مسئلہ بنا رہے ہیں آپ سب......'' شفاء کے پھوپھا سے اب برداشت نہ ہوسکا۔

''مسئلہ ہم بنا رہے ہیں؟...... ہماری تو بے عزتی ہو رہی ہے......'' دولہا کے ماموں بھی بیچ میں کود ے۔

''اس میں کوئی بے عزتی کی بات نہیں ہے...... بچی کو پسند نہیں تھا، ہم نے دوسرا بنا دیا، پہننا تو اسی کو تھا۔'' شفاء کے پھوپھا نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''واہ جی! یہ اچھا ہے...... نکاح کے وقت اگر آپ کی بیٹی یہ کہہ دے کہ اس کو دولہا بھی پسند نہیں ہے تو کیا آپ دولہا بھی بدل دیں گے......؟'' جانے کس نے کہی تھی یہ بات۔

''دیکھئے انکل آپ حد سے زیادہ بڑھ رہے ہیں...... اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔'' زایان کے تنبیہی انداز پر انھیں آگ ہی تو لگ گئی۔

''واہ بھائی جان! بیٹے کی بارات لے کر آئے ہو...... یا بے عزتی کروانے؟ چھوٹا سا لڑکا بڑوں کو نصیحت کر رہا ہے۔''

''زایان! خاموش رہو!'' امی نے کانپتی ہوئی آواز میں اسے ڈانٹا۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں مزید نہیں رکنا چاہیے......'' انھوں نے بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا......

''بیگم! مہمانوں کو واپسی کی اطلاع دے دو...... اب ہمیں واپس ہو جانا چاہیے۔''

''جایئے!...... جایئے!!...... آپ کیا سمجھتے ہیں ہماری بہن کو کوئی اور نہیں ملے گا؟ اس کے لیے لاکھوں رشتے ہیں۔'' زایان نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''راحیل کو جب یہ خبر ملی تو وہ سن بیٹھا رہ گیا...... اپنے بزرگوں کے آگے وہ کیا کرے کیا نہ کرے؟...... وہ فیصلہ ہی نہ کر سکا...... وہ سوچتا ہی رہ گیا اور بارات واپس چلی گئی۔

شفاء کا رو رو کر برا حال تھا...... امی شدت غم سے بیہوش ہوگئی تھیں، سب انھیں ہوش میں لانے کے لیے مصروف تھے...... سارے رشتہ دار ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔

''اب کیا ہوگا......؟ کتنی بے عزتی ہوئی ہے؟ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔'' ابا کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''جو ہوگیا اسے بھول جاؤ......! ہمیں اس مسئلہ کا حل ڈھونڈنا ہے، ہماری بیٹی شفاء آج ہی رخصت ہو کر آج ہی اپنے سسرال جائے گی...... میرا بیٹا سرمد اتنا برا بھی نہیں ہے۔''...... انھوں نے بے حد خاموش کھڑے سنجیدہ سے سرمد کو دیکھا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ......؟'' ابا نے جھکے ہوئے سر کو اٹھایا۔

''ہاں! ہوسکتا ہے سرمد، شفاء کی قسمت میں لکھا ہو...... اسی لیے تو ایک معمولی سا جوڑا بہانہ بن گیا......'' وہ مسکرا کر بولے تو ابا ان سے لپٹ گئے۔

''مبارک ہو بھائی جان......!'' سب سے پہلے خالہ جانی نے بڑھ کر انھیں مبارکباد دی...... سرمد نے ایک نظر سب کو دیکھا...... پھر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے سرمد؟ تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو......؟'' بڑی باجی نے پوچھا۔

''بات میری خوشی کی نہیں ہے بڑی باجی! شفاء سے بھی پوچھ لینا چاہیے......'' اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''اسے کیا اعتراض ہوگا بھلا؟ اسے تو تمہارا احسان مند ہونا چاہیے''

''پلیز باجی! آپ ایسی بات دوبارہ مت کہیے......'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''بہرحال! آپ پہلے شفاء سے پوچھ لیں...... اس کی مرضی معلوم کرلیں، اگر وہ راضی ہو تو، خوش ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں......۔''

اور دو ہی گھنٹے بعد وہ اس کی منکوحہ بن کر اس کے کمرے میں موجود تھی، سرمد نے کمرے میں آنے کے بعد اسے ایک نظر دیکھا...... وہ مسلسل روتی رہی تھی۔

''شفاء!'' وہ اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا، وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور آنسو اس کے رخسار بھگو رہے تھے۔

''شفاء!'' سرمد کی آواز کچھ بلند تھی...... اس نے ذرا سا سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا، اس کے آنسو اور شدت سے بہنے لگے۔

''بس چپ ہو جاؤ اب......!'' سرمد نے اس کے بہتے آنسو اپنی انگلیوں کے پوروں سے صاف کیے، تب وہ بچوں کی طرح روتے ہوئے اس کے سینے سے آ لگی۔

وہ بے حد خوف زدہ تھی......نہ جانے سرمد اس کے ساتھ کیا سلوک کرے، اسے اپنی زیادتیاں یاد آنے لگیں، کس قدر بے وقوفانہ حرکتیں کی تھیں اس نے، لیکن سرمد کا وہ دھیما لہجہ......آہستگی سے محبت سے اس کی پیٹھ تھپتھپانا......وہ محبتوں سے گندھا لہجہ، اس وقت اس کے چہرے پر جو نرم جذبات تھے اس سے اسے کچھ ڈھارس سی ہوئی، یہی سرمد جو اسے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا......اب دل میں اترتا محسوس ہو رہا تھا......شاید یہ نکاح کے دو بولوں کا کمال تھا، اب یہی سرمد کتنا اپنا سا لگ رہا تھا۔

ہاتھ منہ دھو کر، کپڑے تبدیل کر کے جب وہ اندر آئی تو سرمد دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے، چھت پر نظریں ٹکائے مسلسل سوچ میں گھرا محسوس ہوا، وہ بھی آہستگی سے بیڈ کے ایک کنارے پر ٹک گئی۔

''تم خوش تو ہونا شفاء......؟''

''یہی سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے......''

اس کی اس بات پر وہ سنجیدہ سا ہو کر اُٹھ بیٹھا......

''کیا تم نہیں جانتیں......؟ میں نے کئی بار تمھیں اپنی محبت کا احساس دلایا تھا، لیکن تم نے ہی تو...... خیر جانے دو......راحیل کے ساتھ تمھاری شادی طے ہوگئی تو دکھ کے ساتھ میں بے حد دعاء گو بھی تھا، تمھاری خوشیوں کا طالب، پھر اس ناخوشگوار واقعہ کے بعد جب ابو نے مجھ سے تمھارے بارے میں پوچھا تو میں تمھارے ہی دکھ کے بارے میں دکھی ہو رہا تھا......میں تو اچھی طرح ابو کی بات کو سمجھ ہی نہ سکا......۔''

چند لمحہ توقف کے بعد وہ پھر کہنے لگا......

''میں نے تو اس لمحہ صرف یہی سوچا تھا کہ جانے تم بھی راضی ہو یا نہیں......تمھاری مرضی اور تمھاری خوشی میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے، تمھیں حق تھا کہ تم مجھے قبول کرتیں یا انکار کر دیتیں......۔''

''میں کیسے انکار کر سکتی تھی......؟'' شفاء نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں! شاید تم مجبور ہوگئی تھیں......'' سرمد نے افسردگی سے کہا۔

تب اس نے احتجاجی لہجے میں کہا...... ''نہیں سرمد! ایسا نہیں ہے......، اسی لمحہ تو مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ میں تو راحیل کی صرف شکل و صورت سے ہی متاثر ہوئی تھی...... دراصل وہ میرا شوہر بننے کا حقدار ہی نہیں تھا......کس کام کا ایسا مرد جس کے ہاتھ میں کوئی اختیار ہی نہ ہو؟ وہ خاموشی سے اپنے والدین کے ساتھ لوٹ گیا...... میں مانتی ہوں، غلطی میری بھی تھی، مگر اتنی بڑی بھی نہیں کہ وہ میرے بارے میں کچھ بھی مثبت سوچ نہیں رکھ سکا......مرد اتنے بے اختیار تو نہیں ہوتے...... مجھے بزدلی سے سخت نفرت ہے، خاص طور پر بزدل مرد سے......'' اس نے اپنے غصہ کو کنٹرول کرتے ہوئے اپنی سانسوں کو بحال کیا، سرمد اک ٹک اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

''جب خالہ جانی نے ہمارے بارے میں بات کی تو مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں...... خالہ جانی نے کہا: اگر میں راضی ہوں بخوشی؛ تو وہ بھی اپنے بزرگوں کی خواہش سے اتفاق کرے گا، ورنہ وہ انھیں سہولت سے ٹال دے گا...... یہ سن کر مجھے تمھاری جرأت و ہمت سے حوصلہ ملا، اسی نازک لمحہ میں تمھارے عزم و حوصلہ نے مجھے بہت متاثر کیا، میں نے محسوس کیا کہ میرے دل سے تمھارے لیے نفرت کے جذبات ختم ہو گئے ہیں، میرے دل نے عجیب سکون و ٹھنڈک محسوس کی، غیر ارادی طور پر میں نے خالہ جانی سے ''ہاں'' کہہ دی......میری اس سچائی پر یقین نہ ہو تو مجھے ابھی اپنا فیصلہ سنا دو۔'' کہتے کہتے شفاء نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور بے اختیار رونے لگی۔

سرمد اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا......آہستہ سے اس نے شفاء کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

''شفاء! میں نے کہا تھا نا کہ میں تمھاری آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں...... جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ......اب تم سن لو غور سے! تم کبھی یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تم پر کوئی احسان کیا ہے، اور میں آج تم سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھی کبھی بھی تم سے یہ تلخ و ناخوشگوار باتیں تمھارے سامنے نہیں دوہراؤں گا...... ماضی بھولنے والی چیز نہیں ہوتی؛ لیکن......ہم اپنے ماضی کو یکسر بھول جائیں گے اور صرف حال کو خوشگوار بنائیں گے...... بولو! میرا ساتھ دوگی......؟'' سرمد نے اس کی ہتھیلیوں کی پشت پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

شفاء نے آہستہ سے اپنی پلکوں کی جھالر اٹھائی اور ڈبڈباتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا......اور مسکراتے لبوں کے ساتھ ''ہاں'' کہہ دیا...... سرمد کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ پھیل گئی......خوش آئند وقت کا تصور کر کے دونوں مسکرانے لگے، دل کے گوشوں میں مسرت کی کرن جگمگا رہی تھی......جو دُکھوں کے سارے اندھیرے دور کر رہی تھی۔

□□□

**Khairunnisa Aleem**
H.No: 16-2-141/B, Flat No: 301,
Near Officers Mess, Malakpet
Hyderabad. 500036. T.S.

# نصیب

نزہت نبیلہ

آج پھر سے وہ ریزہ ریزہ ہوئی تھی۔ اس کا وجود پھر سے پامال ہوا تھا...... اور وہ بھی کسی اپنوں نے یہ چوٹ پہنچائی تھی۔ وہ بہت تھک چکی تھی ایک بار نہیں کئی بار وہ اس اذیت سے گزر چکی تھی۔ لیکن آج جس طرح وہ مجروح ہوئی تھی دل ناسور بن کر ٹپک رہا تھا...... وہ خود سے سوال کر رہی تھی آخر کیوں؟

آئینہ کے پاس کھڑی وہ خود کو نہار رہی تھی...... اس کے نقش ونگار تو ٹھیک ہی تھے۔ بال گھنے اور لامبے تھے، آنکھوں میں ایک کشش تھی، ناک بھی ٹھیک تھی۔ نہ زیادہ لمبی اور نہ ہی چپٹی۔ ہونٹ بھی ملا جلا کر صحیح تھے نہ پتلے نہ موٹے...... قد و قامت سب کچھ تو ٹھیک تھا۔ بس ایک کمی تھی وہ رنگ کی...... اس کا رنگ تھوڑا سانولا تھا (اور بہنوں کی طرح گوری نہیں تھی) بس رنگ کی وجہ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اس کی آنکھیں چھوٹی ہوتیں، ناک چپٹی ہوتی، ہونٹ موٹے ہوتے...... لیکن اس کا رنگ گورا ہوتا تو شاید وہ بھی خوبصورت کہلاتی...... کیونکہ گورا رنگ ہی تو شاید خوبصورتی کی نشانی ہوتی ہے۔

ثمرین شیخ چار بہنیں تھیں، وہ دوسرے نمبر پر تھی (ان کا کوئی بھائی نہیں تھا)

ابو بینک میں ملازمت کرتے تھے۔ اچھا خوشحال گھرانہ تھا...... ابو نے اپنی بیٹیوں کو کبھی لڑکوں سے کم نہیں سمجھا انھیں اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔

آفرین آپی نے ایم۔ سی۔ اے مکمل کیا ہی تھا کہ ان کا رشتہ آ گیا اور ان کی چٹ منگنی پٹ شادی ہوگئی اور پہلی دفعہ اس کا دل تب ٹوٹا تھا جب ابو کے رشتہ دار آپی کی شادی پر آئے تھے اور انھوں نے زرمین کا ہاتھ اپنے انجینئر بیٹے کے لیے مانگ لیا تھا۔

جبکہ امی نے دبے لفظوں میں اس کا تذکرہ کیا تھا...... کیونکہ زرمین سے وہ بڑی تھی (اس لیے اس کی شادی پہلے ہوئی تھی) لیکن ابو کے رشتہ داروں نے ابو کو اس طرح راضی کر لیا کہ ابو رشتے سے انکار نہیں کر سکے ''کیونکہ لڑکا شارجہ میں انجینئر تھا'' اور انھیں جہیز کے نام پر کچھ نہیں چاہیے تھا'' امی کے رشتہ داروں نے بھی امی کو سمجھایا تھا کیا ہوا طاہرہ اگر نمرین بڑی ہے تو؟ آج کل لوگ بڑی اور چھوٹی کہاں دیکھتے ہیں...... گھر بیٹھے رشتہ آیا ہے اور اتنا اچھا رشتہ ڈھونڈنے سے نہیں ملتا...... اللہ نے چاہا تو جلد ہی نمرین کا بھی رشتہ مل ہی جائے گا۔

اور نہیں چاہتے ہوئے بھی امی کو حامی بھرنی پڑی تھی۔

اور ان لوگوں نے چھوٹی سی تقریب رکھ کر منگنی کی رسم ادا کر دی اور چھ ماہ بعد شادی کی تاریخ بھی طے کر گئے۔

وہ ایم ٹیک کر رہی تھی اس نے خود کو پڑھائی اور گھر کے کاموں میں مصروف کر لیا تھا...... لیکن کہیں نہ کہیں اس کے اندر بھی ایک ہوک سی اٹھتی تھی۔ جسے وہ کسی پر عیاں ہونے نہیں دیتی تھی......

آخر وہ بھی تو اوروں کی طرح ایک لڑکی تھی۔ اس نے بھی تو کچھ خواب سجا رکھے تھے، کیا ایک سانولی لڑکی کو خواب دیکھنے کا حق نہیں ہوتا۔ اس کا جواب وہ کس سے مانگ سکتی تھی۔

رشتے تو کئی آئے۔ لڑکی دیکھنے کے بعد یہ کہہ کر چلے جاتے کہ ہم لوگوں کو سب کچھ پسند ہے لڑکے سے بات کر کے جواب دیں گے اور پھر ان لوگوں کے جانے کے بعد کوئی جواب نہیں آتا۔ کوئی کہتی گھر جا کر مشورہ کر کے جواب دیں گے......اور کوئی جواب نہیں آتا۔

اور پھر زرمین کی شادی کا دن آن پہنچا......اور زرمین کی شادی بھی نہایت شاندار طریقے سے ہوگئی، شادی میں وہ پیش پیش رہی تا کہ کسی کو یہ محسوس نہیں ہو سکے کہ اس کے دل کے اندر کتنے طوفان اٹھ رہے ہیں۔

ابو کی وہ پیاری تھی امی کی بھی وہ دلاری ...... کیونکہ اس میں ہزاروں خوبیاں موجود تھیں اس نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھر کی ساری ذمہ داری بھی سنبھال رکھی تھی۔

وہ اپنی چھوٹی پھوپھی پر گئی تھی......امی کہتی چھوٹی پھوپھی کی شادی میں بھی بہت پریشانیاں آئی تھیں تو پھر منجھلے ابو کے ساتھ ان کے ادل بدل (گولٹ) شادی کرنی پڑی تھی۔

امی کے مطابق اگر اس کا بھی بڑا بھائی ہوتا تو وہ نمرین کی شادی بھی ادل بدل (گولٹ) کر لیتیں...... وہ خاموشی سے سب کچھ سنا کرتی......

خالہ بوا پھر سے رشتہ لے کر آ گئی تھیں......خالہ بوا کا دعویٰ تھا کہ ان لوگوں کو خوبصورت لڑکی نہیں سلیقہ مند اور نیک سیرت لڑکی چاہیے...... اللہ نے چاہا تو اس بار لوگ لڑکی کو ضرور پسند کر لیں گے۔

لوگ لڑکی دیکھنے تو آتے ایسے رسماً تیار ہو کر اسے ٹھنڈا، چائے، ناشتہ لے کر خود کی نمائش کروانے کے لیے حاضر ہونا پڑتا" وہ مجبور تھی امی اور ابو کی خاطر" ورنہ وہ ایسے لوگوں کو منہ لگانے والی خود نہیں تھی۔ جسے لڑکی کی خصوصیت اور سیرت کی نہیں...... بلکہ گھر میں سجانے کے لیے شوپیس کی ضرورت ہے وہ بار بار مجروح ہوتی رہی۔ نہ جانے یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔

اس نے سرد آہ بھر کر سوچا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد امی کہتی بیٹا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے اور میری بیٹی تو نیک سیرت ہے اللہ میری بچی کا نصیب ضرور اعلیٰ بنائے گا...... اور وہ حسرت سے امی کو دیکھتی رہ جاتی۔!

امی ان دنوں کچھ بیمار رہنے لگیں وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ امی کو اس کی فکر لاحق ہوگئی ہے وہ امی کو اس طرح پریشان اور بیمار نہیں دیکھ سکتی تھی۔

**"لوگ لڑکی دیکھنے تو آتے ایسے رسماً تیار ہو کر اسے ٹھنڈا، چائے، ناشتہ لے کر خود کی نمائش کروانے کے لیے حاضر ہونا پڑتا" وہ مجبور تھی امی اور ابو کی خاطر" ورنہ وہ ایسے لوگوں کو منہ لگانے والی خود نہیں تھی۔ جسے لڑکی کی خصوصیت اور سیرت کی نہیں...... بلکہ گھر میں سجانے کے لیے شو پیس کی ضرورت ہے وہ بار بار مجروح ہوتی رہی۔ نہ جانے یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔"**

اس نے خود میں حوصلہ اور ہمت پیدا کی......وہ اس سلسلہ میں امی سے خود بات کرے گی حالانکہ وہ ایک مشرقی لڑکی تھی......والدین سے اس طرح کی گفتگو کرنا اسے زیب نہیں دیتا۔

وہ امی کا سر دباتے ہوئے کہہ رہی تھی......امی آپ میری شادی کے لیے ناحق پریشان ہیں۔ امی میری جیسی کئی لڑکیاں آج کنواری بیٹھی ہیں۔ وہ لڑکیاں خوبصورت بھی ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی شادی نہیں ہو پاتی کیونکہ ان کے پاس جہیز دینے کے پیسے نہیں ہوتے۔ اور جو پیسے کے لالچ میں لڑکیوں سے شادی کرتے ہیں وہ بعد میں لڑکیوں کو اتنا پریشان کرتے ہیں کہ وہ لڑکیاں میکے واپس آنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں......چھوٹی چھوٹی باتوں پر علاحدگی ہو جاتی ہے۔ ان لڑکیوں کے ساتھ ان لڑکیوں کے والدین بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ امی ایسی کئی لڑکیاں ہیں جن کے ایک دو بچے بھی ہیں اور شوہر نے انھیں چھوڑ دیا اور وہ بیچاری باپ کی دہلیز پر واپس آ گئیں اور مجبوراً انھیں نوکری کا سہارا لینا پڑا......پھر ایسی شادی کا کیا امی......؟

میں مانتی ہوں امی آٹھ دس لاکھ لے کر بہت سارے لڑکے مجھ سے بھی شادی کرنے کو تیار ہو جائیں گے لیکن کیا وہ دل سے مجھے قبول کریں گے؟ ہرگز نہیں" کیونکہ آج ہر لڑکوں کی پسند خوبصورت لڑکی ہوتی ہے۔ لاکھوں دے کر میری مانگ میں افشاں سج جائے گی۔ لوگ خوش ہو جائیں گے۔

سماج خوش ہو جائے گا لیکن ان کے گھر والے اور لڑکا خود محض اس لیے اسے غلام بنا کر رکھے گا کیونکہ وہ ایک سانولی لڑکی ہے اور سانولی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رہے گی اور امی میں یہ سب نہیں سہہ سکتی ہرگز نہیں۔

شادی تو خوشی کا نام ہوتا ہے......ایسی شادی سے کیا حاصل جس میں گھٹ گھٹ کر جیا جائے......اس لیے آپ میری شادی کا ارمان نکال دیں۔

**مامی اپنے ساتھ زرمین کی شادی کی سی۔ ڈی لے گئی تھیں اور آج مامی کال آیا تھا...... وہ امی سے معذرت کر رہی تھیں...... وہ بہت شرمندہ تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ طلحہ نے زرمین کی شادی کی سی ڈی دیکھی ہے وہ نمرین کے بجائے فرحین سے شادی کرنا چاہتا ہے۔وہ بار بار افسوس ظاہر کر رہی تھیں۔ میں نے طلحہ کو بہت سمجھایا کہ نمرین بہت ہی اچھی لڑکی ہے ساری خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ صرف رنگ کی کمی ہے۔ لیکن وہ صاف لفظوں میں انکار کر گیا۔ طاہرہ آج کے بچوں کو ہیرے کی پرکھ کہاں ہے میں تم سے اور نمرین سے بھی بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دینا!**

میں ایم ٹھیک کر رہی ہوں......انشاءاللہ مجھے اچھی نوکری مل جائے گی......میں اپنے گھر میں رہ کر اپنے ابو امی کی دیکھ بھال کروں گی......امی کے بہتے آنسوؤں کو دوپٹہ سے خشک کرتے ہوئے ان کی پیشانی کو چومتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

اچانک سے بڑے ماموں اور مامی کانپور سے آ گئے......امی اپنے سارے غم بھول کر خوش ہو گئیں تھیں، گھر میں اچانک رونق آ گئی تھی۔

دس دن وہ لوگ رہے۔ سیر و تفریح بھی ہوئی۔ ماموں، مامی اور امی میں بڑی رازداری کی باتیں چل رہی تھیں۔

جانے سے ایک دن قبل مٹھائی منگوا کر مامی نے اسے انگوٹھی اور اپنے ہاتھوں سے دو کنگن اتار کر پہنا ڈالے......وہ اچانک سے اس رشتے پر دم بخود تھی۔

بڑے ماموں کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی......لڑکی کی شادی تین سال قبل ہو چکی تھی شادی پر امی اور آپی گئی تھیں......اس وقت اس کا زرمین اور فرحین کا پیپر چل رہا تھا اس لیے وہ لوگ نہیں جا پائیں تھیں۔

طلحہ نے بزنس مینجمنٹ کر کے اپنے ابو کا بزنس سنبھال رکھا تھا (کیونکہ ان کا خود کا اتنا بڑا بزنس تھا تو نوکری کرنے کی کیا ضرورت) والدین کا لائق بیٹا تھا۔ اس لیے مامی نے طلحہ کے لیے نمرین کا ہاتھ مانگ لیا تھا۔ کیونکہ انھیں نیک سیرت اور گھر کو جنت بنانے والی لڑکی چاہیے تھی اور دس دنوں میں انھوں نے وہ ساری خوبیاں نمرین میں دیکھ لیں۔

امی کو خوش دیکھ کر وہ بھی خوش تھی......لیکن دل ماننے کو تیار نہیں تھا......کیونکہ کافی عرصہ قبل اس نے طلحہ بھائی کو دیکھا تھا اور طلحہ بھائی نے اسے (وہ پڑھائی کے سلسلے میں ہمیشہ باہر ہی رہے)۔

مامی اپنے ساتھ زرمین کی شادی کی سی۔ڈی لے گئی تھیں اور آج مامی کال آیا تھا...... وہ امی سے معذرت کر رہی تھیں...... وہ بہت شرمندہ تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ طلحہ نے زرمین کی شادی کی سی ڈی دیکھی ہے وہ نمرین کے بجائے فرحین سے شادی کرنا چاہتا ہے۔وہ بار بار افسوس ظاہر کر رہی تھیں۔ میں نے طلحہ کو بہت سمجھایا کہ نمرین بہت ہی اچھی لڑکی ہے ساری خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ صرف رنگ کی کمی ہے۔لیکن وہ صاف لفظوں میں انکار کر گیا۔ طاہرہ آج کے بچوں کو ہیرے کی پرکھ کہاں ہے میں تم سے اور نمرین سے بھی بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دینا!

سیل فون کا اسپیکر آن رہنے کی وجہ سے وہ پیچھے کھڑی خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی اور پھر خاموشی سے واپس آ گئی۔

اور تب سے سامنے آئینہ میں کھڑی خود کو نہار رہی تھی۔

آج پھر کسی اپنے نے اس کے خوابوں کو لہولہان کیا تھا......اس کا وجود ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ آنکھوں سے بہتے گرم گرم آنسو گالوں پر نشان چھوڑ گئے تھے۔

امی آپ کہا کرتی ہیں میری بیٹی کا نصیب بہت ہی اعلیٰ ہوگا......

امی شاید میرا یہی نصیب ہے......اور ہم اپنے نصیب کو تو نہیں بدل سکتے!!

□□□

**Nuzhat Nabila**
Purab Sarai
Munger-811201 (Bihar)

# غزلیں

ڈاکٹر عائشہ سمن

شہر دل سے گزر گیا کوئی
خوشبو جیسا بکھر گیا کوئی

مجھ کو مجھ سے ملا دیا کس نے
کام کیسا یہ کر گیا کوئی

آنکھ کی کھڑکیوں سے دیکھو تو
روح تک میں اتر گیا کوئی

پھر کواڑوں نے کی ہے سرگوشی
پھر گلی میں ٹھہر گیا کوئی

میں کوئی آئینہ نہیں لیکن
مجھ سے مل کر سنور گیا کوئی

مرثیہ پڑھ رہی ہے باد صبا
میری چاہت میں مر گیا کوئی

اے سمن آج میرے آنچل میں
اشک بن کر بکھر گیا کوئی

میں خوشبو اور جمال زندگی سے پیار کرتی ہوں
میں پھولوں سے، کلی سے روشنی سے پیار کرتی ہوں

مری زلفوں کے سوکھے موگروں نے گر سکھایا ہے
میں رنجیدہ ہوں لیکن ہر خوشی سے پیار کرتی ہوں

مجھے سونے کے اور چاندی کے زیور کیا دکھاتے ہو
میں کاغذ سے، قلم سے، آگہی سے پیار کرتی ہوں

مجھے صحرا کی ویرانی نے سرگوشی میں بتلایا
کوئی موسم ہو میں زندہ دلی سے پیار کرتی ہوں

محبت کے سفر میں ہے یہی رخت سفر جاناں
میں آنسو سے، کراہوں سے، سبھی سے پیار کرتی ہوں

شراب معرفت پی کر میں جب مدہوش ہوتی ہوں
میں سجدوں سے، تشکر، بے خودی سے پیار کرتی ہوں

مرے جذبوں کے رنگوں نے سمن مجھ کو بتایا ہے
میں رنگ ارغوانی، شربتی سے پیار کرتی ہوں

**Dr. Aaisha Shaikh**
Bandra Reclamation
Bandra (W)
Mumbai-400050 (MS)

ڈاکٹر جوہی بیگم شاما


# غزلیں

یوں زندگی کا زہر پیے جا رہے ہیں ہم
مرنے کی آرزو میں جیے جا رہے ہیں ہم

دامن ہے چاک اپنا گریباں ہے تار تار
اوروں کے پیرہن کو سیے جا رہے ہیں ہم

دنیا کو دل کے داغ دکھانا فضول ہے
اشکوں کا جام ہنس کے پیے جا رہے ہیں ہم

خودداری و انا جہاں ہوتی ہے سنگسار
اس بزم پہ ہی جان دیے جا رہے ہیں ہم

جنبش ذرا سی اس کو نہ کر دے ذلیل و خوار
اس واسطے لبوں کو سیے جا رہے ہیں ہم

جور و ستم پہ اپنے پشیمان تم نہ ہو
الزام اپنے سر یہ لیے جا رہے ہیں ہم

ہر چند حق بیانی پہ معتوب ہیں مگر
شاؔما یہی گناہ کیے جا رہے ہیں ہم

مکر و دغا فریب کا اک مایا جال ہے
وہ شخص جس کی سادگی اپنی مثال ہے

اک وائرس نے یوں ہمیں محصور کر دیا
کوئی نہیں یہ پوچھتا کیا حال چال ہے

نشتر لگائیں آپ تو مرہم کا ہو گماں
یہ ساحری بھی آپ کی واللہ کمال ہے

فیضانِ سیاست ہے یہ در در کا بھکاری
مل جائے اقتدار تو پھر مالامال ہے

قاتل بھی آپ اور مسیحا بھی آپ ہیں
یہ عشق کا معمہ سمجھنا محال ہے

انسانیت کے قتل پہ خاموش تماشا
اور جانور کی موت پہ شاؔما وبال ہے


**Dr. Joohi Begum**
59C/67C, South Malaka,
Prayagraj -211003 (U.P)

# لذیذ پکوان

## بالوشاہی

اجزا: میدہ آدھا کلو، گھی ایک سو پچھتر گرام (پگھلا ہوا)، پانی سوا کپ، سوڈا ایک چوتھائی چائے کا چمچ، دہی دو چائے کے چمچ، امونیم ایک چوتھائی چمچ، بادام ایک سو گرام، پستہ ایک سو گرام، گھی فرائنگ کے لیے

شیرہ کے لیے: چینی ایک کلو، پانی آدھا کلو

بنانے کی ترکیب: ایک پیالے میں گھی، پانی، سوڈا، امونیم اور دہی ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ پھر اس میں میدہ شامل کر دیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر اس کی ڈو بنالیں۔ ڈو کو زیادہ نرم نہ کریں۔

ڈو کے پیڑے بنالیں اور رو بنالیں اور پھر اس کے چھوٹے چھوٹے پیڑے کر لیں۔

ہاتھوں کی مدد سے پیڑوں کو تھوڑا پتلا کر لیں۔ ایک کڑاہی میں گھی کو گرم کر کے آنچ کو ہلکا کر دیں۔ پیڑوں کو کڑاہی میں ڈال دیں۔

جب یہ گولڈن براؤن ہو جائیں تو شیرہ میں ڈال دیں۔ شیرہ جذب ہو جانے پر ڈش میں نکال کر پستہ اور بادام کے ساتھ گارنش کر کے سرو کریں۔

شیرہ بنانے کے لیے: ایک پین لے کر اس میں چینی اور پانی ڈال کر چولہے پر گھلنے کے لیے رکھ دیں اور چمچ کی مدد سے مکس کریں۔ دو منٹ ابال آنے کے بعد چولہے کو بند کر دیں اور تھوڑا ٹھنڈا ہونے دیں۔

## ڈرائی فروٹ کیک

اجزا: میدہ 250 گرام ، مکھن 100 گرام ، دودھ حسب ضرورت ، چینی 125 گرام ، نمک چٹکی بھر، بیکنگ پاؤڈر دو چائے کے چمچے، بادام پستہ بھگو کر چھیل لیں، پندرہ پندرہ گرام، کشمش (دھو کر صاف کر لیں) پندرہ گرام، اخروٹ گری پندرہ گرام، انڈا تین عدد

بنانے کی ترکیب: مکھن میں چینی اچھی طرح پھینٹیں یہاں تک کہ دونوں یک جان ہو جائیں۔ اب انڈا شامل کر کے مزید خوب اچھی طرح پھینٹیں۔ اب میدہ، بیکنگ پاؤڈر، نمک، بادام، پستہ اخروٹ اور کشمش شامل کر کے سانچے میں انڈے موی کاغذ(Vaxpaper) لگا کر آمیزہ ڈال دیں۔

43ڈگری فارن ہائٹ پر ڈیڑھ گھنٹے اوردن میں پکائیں۔

## شکر قند کی کھیر

اجزا: شکر قند ایک پاؤ، دودھ ایک لیٹر، چینی ایک کلو، بالائی ایک پاؤ، سبز الائچی چند عدد، کیوڑا ایک بڑا چمچ، ناریل پسا ہوا ایک چھٹانک، بادام کی گری آدھی چھٹانک

بنانے کی ترکیب: پتیلے میں ڈال کر آگ پر رکھیں، جوش آ جائے تو شکر قند کو ابال کر کتر لیں۔ دودھ میں ڈال دیں، پھینٹی ہوئی بالائی پسے ہوئے سبز الائچی کے دانے اور پسا ہوا ناریل بھی شامل کر لیں۔

ہلکی آنچ پر رکھیں اور چمچ چلاتے رہیں، گاڑھا ہو جائے تو گھوٹ لیں۔ اب چینی ڈال دیں۔ شیرہ گاڑھا ہو جائے تو بادام اور پستہ ڈال دیں۔ دودھ کھیر کی شکل میں آجائے تو کیوڑا ڈال کر دم پر رکھیں۔

کھیر طشتری میں انڈیلیں۔ ورق لگائیں، بادام اور پستہ چھڑکیں مزیدار شکر قند کی کھیر تیار ہے۔

## چھوہاروں کا حلوہ

اجزا: چھوہارے آدھا کلو، دودھ ایک لیٹر، بالائی ایک پاؤ، چینی تین پاؤ، لونگ دو عدد، کیوڑہ ایک بڑا چمچ، بادام کی گری ایک چھٹانک، سبز الائچی چند دانے، گھی ایک پاؤ، زعفران پسی ہوئی آدھی چٹکی

بنانے کی ترکیب: چھوہارے کو دھو کر ٹکڑے کر لیں اور گٹھلیاں نکال دیں، انہیں ایک دو گھنٹے تک دودھ میں بھگو یا رہنے دیں۔ پھر اسی دودھ میں پکا لیں۔

گل جائیں تو اتار لیں اور ٹھنڈا ہونے پر دودھ سے نکال کر پیس لیں۔ پتیلے میں گھی سرخ کریں اور سبز الائچیاں اور لونگ ڈال کر بھونیں۔

اسی میں پسے ہوئے چھوہارے بھون لیں اور دودھ بھی ڈال دیں۔

بالائی کو پھینٹ کر چینی سمیت بادام میں ڈالیں اور چمچ چلاتے رہیں۔

آنچ ہلکی رکھیں دودھ اور چینی کا شیرہ جب گاڑھا بن کر جذب ہونے لگے تو زعفران کو کیوڑے میں ملا کر ڈال دیں۔

حلوہ گاڑھا ہو جائے اور گھی چھوڑنے لگے تو اتار لیجیے۔ چند منٹ تک ڈھکا رہنے دیں۔ ایک طباق میں حلوہ نکال لیں۔

چاندی کا ورق، بادام کی باریک گریاں اور گلاب کی پتیاں حسب ذوق چھڑک لیں۔

(بحوالہ: میٹھا دستر خوان، آذین غوث، سن اشاعت 2019، مکتبہ امام اعظم، دہلی،)

□□□

ڈاکٹر احسان رؤف

# عسر طمث
## (Dysmenorrhoea)

عسرِ طمث خواتین کا بہت ہی عام مرض ہے، یہ عام طور پر اعلیٰ سوسائٹی کی عورتوں کو زیادہ ہوا کرتا ہے۔ عسرِ طمث کو انگریزی میں Dysmenorrhoea کے نام سے جانتے ہیں۔ عسرطمث دولفظوں سے مرکب ہے۔ عسر کے معنی تکلیف کے آتے ہیں جبکہ طمث کے معنی حیض یا Menses کے آتے ہیں۔ چونکہ اس صورت میں حیض کے دوران پیٹ کے نچلے حصہ میں درد ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا نام عسرطمث رکھا گیا ہے۔ عسرطمث حیض(Menstruation) کے دوران ہونے والا وہ درد ہے جس کی وجہ سے خواتین کی روزمرہ کی سرگرمیاں متاثر ہوجاتی ہیں۔

**اقسام(Types)**

عسرطمث کو دوقسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

**ا۔عسرطمث ابتدائی (Primary Dysmenorrhoea)**

اسے Spasmodic یا Intrinsic عسرطمث بھی کہتے ہیں۔

اس صورت میں عام طور پر کوئی سبب نہیں ہوتا ہے، یعنی عانہ کی بیماریاں (Pelvic Diseases) نہیں موجود ہوتی ہیں۔ یہ عموماً 15-20% خواتین میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس صورت میں رحم کی اندرونی غشاء سے ہارمون کے مشابہ مادہ کا اخراج ہوتا ہے جس کی وجہ سے رحم میں انقباض (Contraction) ہوتا ہے پھر اس کے نتیجہ میں درد ہوتا ہے اور رحم کی دموی پرورش بھی کم ہوجاتی ہے۔ حیض کے دوران درد کے لیے عام طور پر Prostaglandin F2X ذمہ دار ہوتا ہے۔

**علامات (Symptoms)**

یہ عام طور پر نوجوان لڑکیوں میں ہوتا ہے۔ اس قسم میں دردِ حیض شروع ہونے سے کچھ گھنٹے پہلے یا حیض کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس میں درد کی شدت عام طور پر کچھ گھنٹوں تک باقی رہتی ہے، بعض اوقات ۲۴ گھنٹہ تک بھی درد ہوسکتا ہے۔ اس میں درد مروڑ کے ساتھ پیٹ کے نچلے حصہ میں ہوتا ہے اور کمر یا ران تک بھی منتقل ہوسکتا ہے۔ درد کے ساتھ قے، دردِ سر، دست، تکان، پسینہ کی زیادتی وغیرہ بھی موجود ہوسکتے ہیں، بعض اوقات مریضہ بے ہوش بھی ہوسکتی ہے۔ اس قسم میں درد عام طور پر حمل (Pregnancy) اور ولادت (Delivery) کے بعد پوری طور سے ٹھیک ہوجاتا ہے۔

**تشخیص(Diagnosis)**

اس قسم میں بطن(Abdomen) کا امتحان کرنے پر کوئی غیر طبعی نتائج نہیں ملتے ہیں اور Ultrasound میں بھی کوئی مرض نہیں پایا جاتا ہے۔

**علاج(Treatment)**

عام تدابیر کے طور پر مریضہ کی عام صحت درست کرائی جائے، مقوی غذائیں دی جائیں، قبض دور کیا جائے۔ حیض شروع ہونے سے دو تین دن قبل مسہل دیا جائے۔ مریضہ کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ اپنے معمولات میں فرق نہ آنے دے، یعنی طمث کے دوران بھی اسکول کالج یا آفس وغیرہ سے غیر حاضر نہ رہے، اس کے علاوہ مناسب ریاضت بھی

کرے، گرم پانی کی بوتل سے بطن(Abdomen) کے زیریں حصہ کی سنکائی سے درد میں کمی ہوتی ہے۔ اور ہلکے دافع درد(Mild Analgesic) اور دافع تشنج(Antispasmodics) دوائیں تجویز کی جاسکتی ہیں۔ عادت ڈالنے والی دوائیں مثلاً Pethidine یا Morphine کا استعمال ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ ان تدابیر سے اکثر مریضوں میں عام طور پر درد میں سکون مل جاتا ہے۔ شدید صورت میں Oral Contraceptive Pills یا جراحت(Surgery) کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

طب یونانی میں عسر طمث کے نام سے اطباء نے تفصیل سے علاج کے بارے میں بتایا ہے۔

اگر مریضہ میں موٹاپا(Obesity) ہو تو وزن کو کم کرنے کی تدابیر کی جائے اس کے لیے میٹھی اور روغنی غذاؤں سے پرہیز کرایا جائے اور دوا میں سفوف مہزل ۵ گرام صبح شام دیا جائے۔

عسر طمث میں مندرجہ ذیل نسخے مفید ہیں۔

شبت، مرزنجوش، فودنج، سداب، بابونہ، ناخونہ سبھی ۴ گرام کے جوشاندہ سے مریضہ کو آبزن(Sitz bath) کرایا جائے

پودینہ 6 گرام کے جوشاندہ کو ماء العسل(Honey water) کے ساتھ استعمال کرایا جائے۔

مرکب ادویہ میں حب حلتیت ۲ عدد صبح شام ہمراہ نسوانی ۲ چمچ صبح شام استعمال کرایا جائے۔

### عسر طمث میں مفید ریاضت

عسر طمث میں مریضہ کو مخصوص ریاضت کرنے سے درد میں سکون ملتا ہے۔ مریضہ پیٹ کے بل زمین پر لیٹ جائے پھر گردن کو اوپر کی طرف اٹھائے اور 10 سیکنڈ تک گردن کو اوپر اٹھائے رکھے پھر گردن کو نیچے کرلے اس طرح سے 3 سے 4 بار کرنے سے Menstrual cramp میں کمی آتی ہے جس سے درد میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس ریاضت کو کوبرا ریاضت (Cobra Exercise) کہتے ہیں۔

**2۔ عسر طمث ثانوی(Secondary Dysmenorrhoea)**

اسے Extrinsic یا Congestive عسر طمث بھی کہتے ہیں، اس صورت میں کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے یعنی عانہ کی بیماریاں(Pelvic diseases) موجود ہوتی ہیں۔ اس قسم میں درد کی وجہ Pelvic کے انسجہ میں تناؤ(Tension) کی زیادتی سے ہوتی ہے۔ Endometriosis, Adenomyosis, Pelvic Adhesion, Uterine Fibroid, IUCD in Utero, Chronic Pelvic Infections, Cervical stenosis عسر طمث ثانوی کے عام

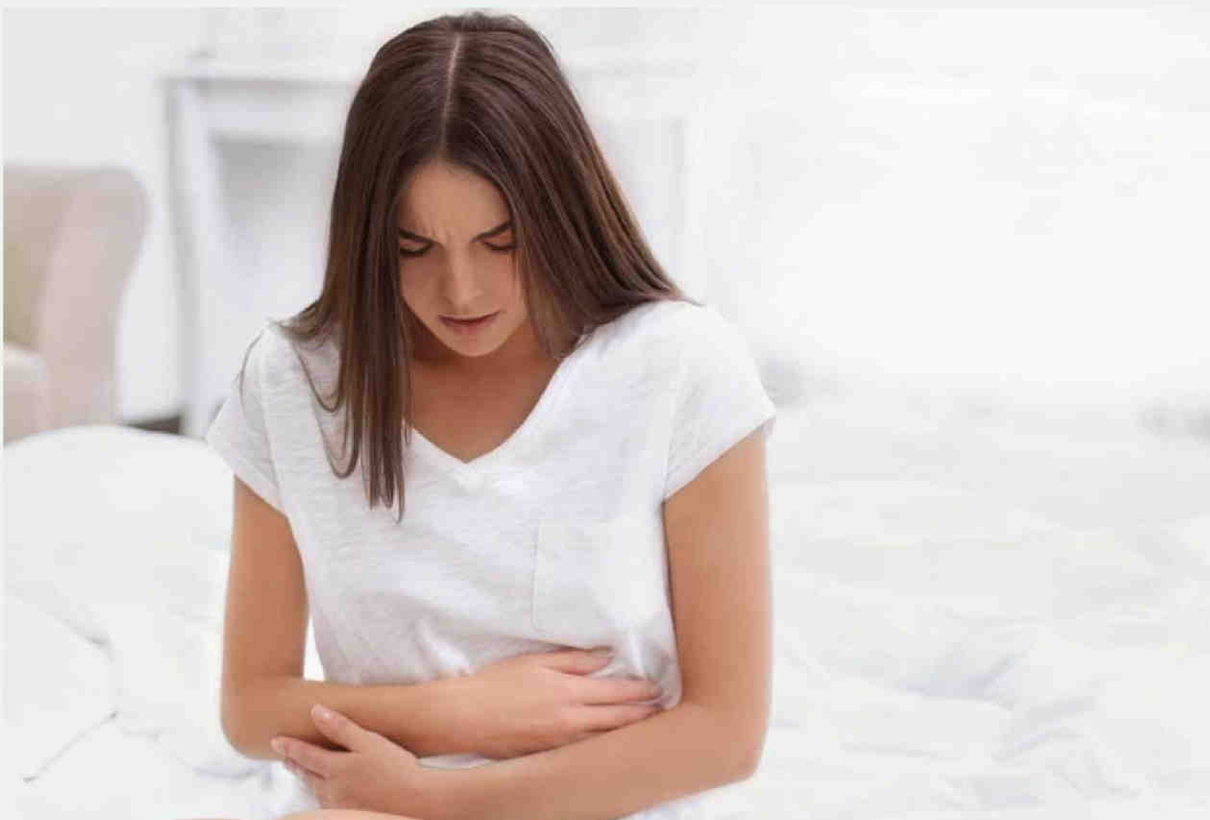

اسباب ہوتے ہیں۔

**علامات (Symptoms)**

اس قسم میں مریضہ عام طور پر اپنی تیس کی دہائی (Thirties) میں ہوتی ہے، درد عام طور پر ہلکا ہوتا ہے، کمر اور اس کے اگلے حصہ میں ہوتا ہے اس میں درد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل (Radiate) نہیں کرتا ہے۔ یہ درد عام طور پر حیض شروع ہونے کے 5-3 دن پہلے ہوتا ہے اور جیسے ہی خون جاری ہونے لگتا ہے درد ختم ہو جاتا ہے۔ بطن (Abdomen) اور مہبل (Vagina) کا امتحان کرنے پر مرض کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔

**تشخیص (Diagnosis)**

اس کی تشخیص میں مختلف جانچیں کرائی جاتی ہیں۔

۔Transvaginal sonography اس ٹسٹ کے ذریعہ بیشتر Pelvic Pathology کا پتہ لگ جاتا ہے۔

۔Saline infusion sonography: اس ٹسٹ کے ذریعہ سے Submcous Fibroid اور Polyp کی تشخیص ہوتی ہے۔

۔Laparascopy: اس کا استعمال تشخیص اور علاج دونوں کے طور پر کیا جاتا ہے۔

**علاج (Treatment)**

عسر طمث ثانوی کا علاج اس کے سبب کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاج میں عام طور پر Antibiotics, Hormone کا استعمال ہوتا ہے یا Surgery کی جاتی ہے۔

**حوالہ جات**


1۔ ڈی سی دتا، ٹکسٹ بک آف گائنا کولوجی، ساتواں ایڈیشن، صفحہ 146-149، جے پی پبلیشر، نئی دہلی، 2016۔

2۔ اسٹنڈرڈ یونانی ٹریٹمنٹ گائڈ لائنس فار کومن ڈزیز، جلد ا، صفحہ 143، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی، 2014

3۔ نسائیات، ڈاکٹر سید محمد عباس رضوی، صفحہ 98-101، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی، 1999۔

4۔ پیٹسی ویسٹ کوٹ، الٹرنیٹو ہیلتھ کیئر فار وومین، صفحہ 58-62، ڈائمنڈ بکس، لندن، 1994

5۔ مائکل پراکٹر، ڈائگنوسس اینڈ مینیجمنٹ آف ڈسمینوریا، صفحہ 1134-1138، برٹس میڈیکل جرنل، 2006

http://www.betterhealth.vic6



**Dr. Ehsan Rauf**

476/6C Behind Madeh Ganj

Police Chowki, Sitapur Road

Lucknow-226020 (U.P)

# حسن کی نگہداشت

### پودینے میں چھپے ہیں جلد کے 5 اہم راز جو کریں آپ کی خوبصورتی میں اضافہ

گھر میں مختلف کھانوں کے ساتھ ذائقہ بڑھانے کے لیے پودینہ ڈال کر ہم سب کھاتے ہیں اور یہ وہ سبزی ہے جو ہر گھر میں ضرور ہی آتی ہے۔ خواتین اس کے پتے توڑ کر فریج میں محفوظ رکھتی ہیں کیونکہ پودینہ تازگی کا اہم ذریعہ ہے۔ اب اگر پودینے کی افادیت اور غذائیت سے متعلق بات کی جائے تو پودینہ ہماری صحت وخوبصورتی کے لیے بہت ضروری اور سستا کاسمیٹک پراڈکٹ ہے۔

**اجزا:** پودینے میں پوٹاشیم، میگنیشم، کیلشیم، فاسفورس، آئرن، وٹامن اے اور سی پایا جاتا ہے جو جسمانی تازگی اور خوبصورتی کو بڑھانے کے لیے مفید سمجھا جاتا ہے۔

**فوائد:** پودینے کے ڈھیروں فوائد ہیں جن میں چند خاص اور اہم بیوٹی کے راز ہم آپ کو بتا رہے ہیں تاکہ اب سے آپ بھی سستے سے پودینے سے اپنے مہنگے بیوٹی پراڈکٹ کو کریں بائے اور بڑھائیں اس سے اپنی بیش بہا خوبصورتی۔۔۔

**ایکنی:** ایکنی بہت ضدی ہوتی ہے یہ تو آپ جانتی ہیں۔ مگر اس کے لیے آپ اگر پودینے کا استعمال کریں گی تو یہ کنٹرول ہو جائے گی کیونکہ پودینے کی تیز ٹھنڈک ایکنی کو جڑ سے نکالنے کا کام کرتی ہے اور جلد کے مساموں میں موجود گندگی کو صاف کرتی ہے۔

**طریقہ:** پودینے کے پتوں کو دھو کر بلینڈر میں ڈالیں اور ساتھ میں ایک برف کیوب ڈال کر پیسٹ بنالیں اور اس کو ایکنی پر لگائیں صبح اور رات دن میں دو مرتبہ یا جب بھی آپ کو وقت ملے۔ یہ ایسا نسخہ ہے جس کے سائیڈ افیکٹ بھی نہیں ہیں اور جلد کی صفائی بھی ہو جاتی ہے۔

**خشکی:** بالوں میں خشکی وسکری کے مسائل آپ کے ساتھ بھی ہیں، روکھے بال ہیں بے جان ہیں تو پودینہ آپ کے بالوں

میں دوبارہ جان ڈالنے کے لیے بہت مفید ہے۔

**طریقہ:** پودینے کے پیسٹ کو دہی میں مکس کریں اور بالوں میں لگالیں اس سے بالوں میں جان تو آئے گی ساتھ ہی بالوں کی نشوونما بھی بڑھے گی۔

**ناخن:** ناخنوں میں فنگس پڑگئی ہے یا کسی وجہ سے خراب دکھ رہے ہیں تو آپ پودینے کی اینٹی بیکٹریل اور اینٹی فنگل خصوصیات سے فائدہ اٹھائیں۔

**طریقہ:** پودینے کے پتے کو ناخن پر رکھیں اور روئی لپیٹ لیں ایک یہ طریقہ بھی آسان اور فائدہ مند ہے، اس کے علاوہ آپ پتوں کا پیسٹ بنائیں اور ناخنوں پر لگا کر چھوڑ دیں۔ خشک ہونے پر دھولیں، بعد میں ناخنوں کو تھوڑی سی بھاپ دیں اور ایک کپڑے کی مدد دے ناخن صاف کرنے کی کوشش کریں آہستہ آہستہ فنگس نکل جائے گی۔

**ہونٹ:** ہونٹ آپ کے پھٹے رہتے ہیں یا کالے ہونے لگے ہیں تو پودینے کی طرف ایک نظر ڈال لیں اور خوبصورت نرم ملائم ہونٹ پائیں۔

**طریقہ:** گلاب کے عرق میں پودینے کا پیسٹ اور بالائی مکس کریں اس کو ہونٹوں پر لگائیں۔ اتنے نرم اور صاف ہونٹ ہوجائیں گے کہ آپ خود فرق محسوس کریں گی۔

**رنگت:** رنگ صاف تو سب ہی چاہتے ہیں اب پودینے کو بھی ایک مرتبہ لگا کر دیکھ لیں اس میں موجود وٹامن آپ کا رنگ گورا کرنے کے لیے بہت آسانی پیدا کر سکتے ہیں۔

**طریقہ:** پودینے کے پتوں کے پیسٹ میں ابٹن مکس کر کے چہرے پر لگائیں یہ دوہرا برائٹننگ فارمولا ہے جو اپنی ٹھنڈک اور تازگی کی وجہ سے آپ کی رنگت میں نکھار پیدا کرتا ہے۔

## لپ سٹک لگائے بغیر بے بی پنک ہونٹ بنانا چاہتی ہیں تو ایک چمچ گلیسرین کو بتائے گئے طریقے سے استعمال کریں اور ہونٹوں کو خوبصورت بنائیں

ہماری مسکراہٹ چہرے کی خوبصورتی کو اور زیادہ بڑھا دیتی ہے لیکن اگر ہونٹ پرکشش نہ ہوں تو مسکراہٹ ماند پڑ جاتی ہے۔ اور اگر آپ بھی چاہتی ہیں آپ کے ہونٹ بے بی پنک ہو جائیں وہ بھی بغیر کسی لپ سٹک لگائے تو بس ایک چمچ گلیسرین کی یہ ٹپس جانیں اور ہونٹوں کو حسین بنائیں۔

**فائدہ:** ☆ گلیسرین جلد میں ہائیڈروجن کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے جس کی وجہ سے ہونٹ نرم و ملائم بھی ہوجاتے ہیں اور ان کی رنگت بھی گلابی ہوجاتی ہے۔

☆ اس میں الفا ہائیڈروکسی ایسڈز، لیکٹک ایسڈز، گلائیکولک ایسڈ، ہائیلورونک ایسڈ، پروپیلین گلائیکول، سوربیٹول، بیوٹیلین گلائیکول اور کاربیمائیڈ جیسے نامیاتی مرکبات پائے جاتے ہیں جو اس کو آپ کے ہونٹ پنک پنک بنانے میں مدد دیتے ہیں۔

**ٹپس:**

☆ ایک چمچ گلیسرین میں دو چمچ عرقِ گلاب مکس کر کے ہونٹوں پر لگائیں اس سے ہونٹوں کی جلد نرم و ملائم بھی ہوجائے گی اور ہونٹ موائسچرائز بھی رہیں گے۔

☆ ایک چمچ گلیسرین میں آدھا چمچ چُقندر کا رس مکس کرلیں اور ہونٹوں پر لگائیں اس سے پھٹے ہوئے ہونٹ جلد از جلد ٹھیک ہوجائیں گے اور خون بھی نہیں نکلے گا۔

☆ اگر آپ کو ہونٹوں پر سوزش و جلن کی شکایت رہتی ہے تو ایک چمچ گلیسرین میں ویزلین مکس کر کے ہونٹوں پر لگائیں۔ اس سے جلن یا سوزش کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا اور ہونٹ پنک بھی ہوجائیں گے۔

☆ اگر آپ چاہتی ہیں کہ لپ سٹک بھی نہ لگائیں اور ہونٹ بھی پنک ہوجائیں تو ایک چمچ گلیسرین میں زردے کا رنگ اور ایک چمچ دودھ کی بالائی مکس کر کے روزانہ صبح ہونٹوں پر لگائیں یا دن میں کسی بھی وقت 20 منٹ کے لیے لگا کر چھوڑ دیں اس سے آپ کو جلد رزلٹ مل جائیں گے۔

(بحوالہ: www.kfoods.com)

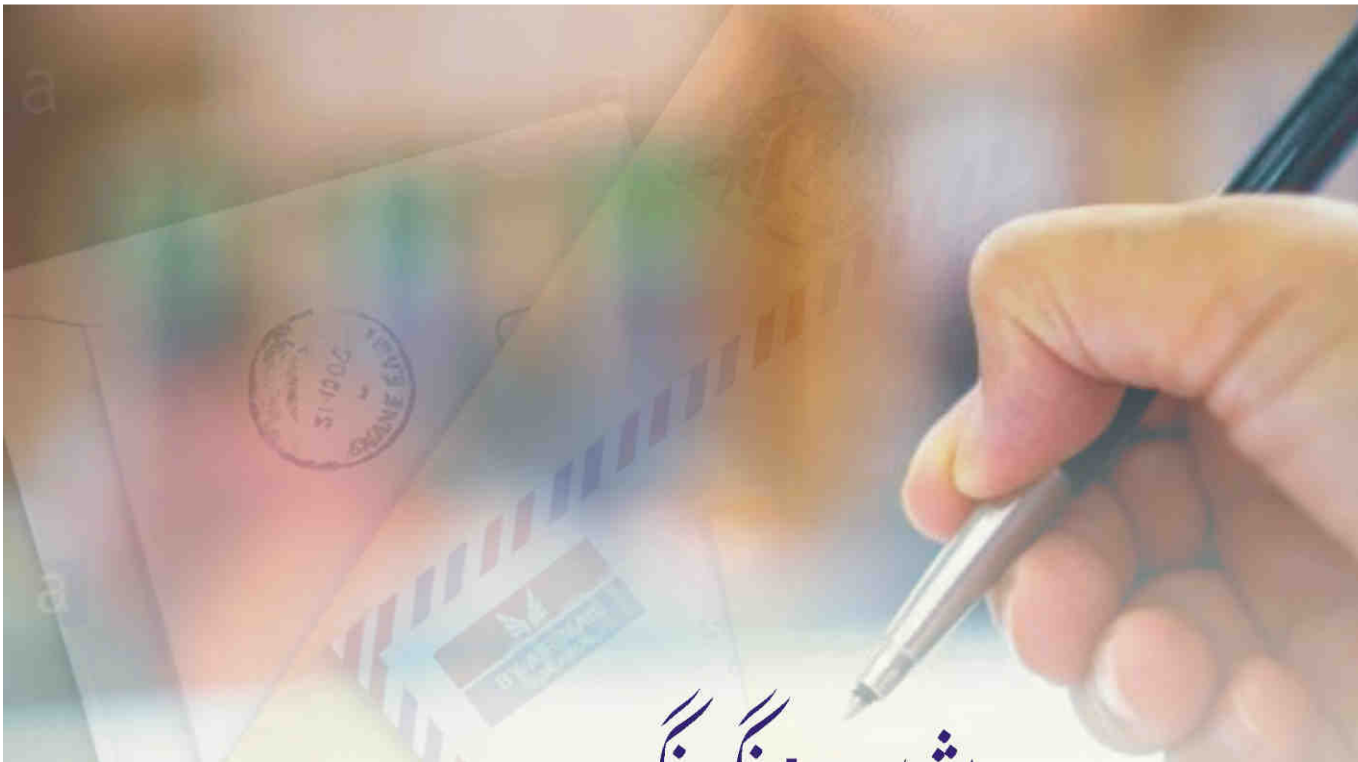

# تاثرات: نگر نگر سے

’’خواتین دنیا‘‘ جولائی 2020 یہی کوئی 23/نومبر 2020 کو موصول ہوا۔سرورق پر گویا کھینچی گئی تقدس وتوجہ میں غرق قلمی تصویر کو مضمون ’’......میرابائی‘‘ (ص5) سے مناسبت ہے۔ اسی لیے یہی سرِ ورق کی کہانی ہوئی۔کیا خیال ہے؟ کورونا-19 کے لاک ڈاؤن میں دِلّی سے لے کر گلّی تک تمام تر انتظام تہہ وبالا ہوگیا۔اسی لیے مجلّات کی ترسیل میں بھی بے قاعدگی ہوگئی، ورنہ ابھی تک نومبر کیا، سمبر 2020 کا شمارہ تک ہمدست ہو چکا ہوتا۔خیر دیر آید درست آید۔

زیرِنظر شمارہ میں دی گئی دس شہ سرخیوں کے ذیل میں کوئی 16، اچھے بیانیے مندرج ہیں۔ مشعل کے تحت اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ کورونا وائرس سے اس وقت پوری دنیا ذہنی انتشار میں مبتلا ہے، لیکن اِس بحران سے ایک نیا باب سامنے آئے گا جو ادب کو نئے سرے سے سمجھنے میں ہماری مدد کرے گا۔ یہ تمام تر بیان ہمت افزاء اور ڈھارس بندھانے والے ہیں۔ بقول شاعر ؎

زیاں میں بھی ہے فائدہ کچھ نہ کچھ
تمھیں مل رہے گا صلہ کچھ نہ کچھ

ص5 پر دیا گیا مضمون بعنوان ’’مقدس دیوانگی کی مثال میرابائی‘‘ کوَر اسٹوری ہے جس میں عشق مجازی سے عشق حقیقی کے منازل کا تذکرہ ہے، بلکہ جو عشق مجازی سے قطعاً نابلد اور بالراست عشق حقیقی میں سر بہ سر غرق ہیں، اس میں معشوق کے کوئی بائیس روپ بتائے ہیں لیکن عشق حقیقی کے یہ روپ ہزاروں سے بھی تجاوز کر سکتے ہیں۔اس تمام تر مضمون میں میرابائی کی زندگی اور کلام کے تقریباً ہر گوشہ کا احاطہ کیا گیا ہے جو بار بار پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔زبان وبیان اور پیشکش میں بڑی ہی دلکشی وچاشنی ہے۔عرصۂ دراز بعد ایسی سحر آگیں عبارت نظر نواز ہوئی۔بہرحال اصغر گونڈوی کے مطابق ؎

ذوق سرمستی کو محو روئے جاناں کردیا
کفر کو اس طرح چمکایا کہ ایماں کردیا
ان بتوں کی صورتِ زیبا کو اصغر کیا کہوں
پر خدا نے وائے ناکامی مسلماں کردیا

شاعرات کے منتخب اشعار (ص11) میں سیّدہ شان معراج کے دونوں اشعار درحقیقت منتخب اشعار ہیں۔’’جہانِ نسواں‘‘ (ص12 تا 43) میں کوئی چھ مقالے درج ہیں۔ ان میں ’’غربت کی نسواں کاری......‘‘ نہایت مدلّل ہے، مگر یہ پی ایچ.ڈی کا مقالہ لگتا ہے۔’’کہانیاں‘‘ (ص44 تا 50) کے تحت دو کہانیاں درج ہیں۔ کہانی ’’پناہ‘‘ فی الواقعی دلچسپ مگر پُر کسک ہے۔جبکہ ’’بھوک‘‘ کرونا وائرس کے اثرات پر لکھی گئی ایک متاثر کن کہانی ہے جو بھلی لگی۔ مابقی مشمولات میں ’’حسن سخن‘‘ (ص51)، ’’باورچی خانہ‘‘ (ص54) ’’صحت‘‘ (ص56)، ’’آرائش وزیبائش‘‘ (ص59) اور ’’تاثرات‘‘ (ص61) حسب معمول اچھے تو لگنے ہی تھے۔

**مصطفی ندیم خان غوری**، زرّین ولا، بی-۱۱، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

## قومی پالیسی برائے تعلیم 2020

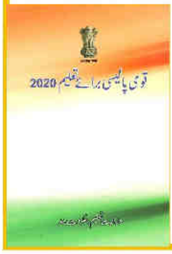


وزارت تعلیم، حکومت ہند

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 116

قیمت: 35 روپے

## بھارت کا آئین

چھٹی اشاعت: 2019

صفحات: 515

قیمت: 330 روپے

## اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ

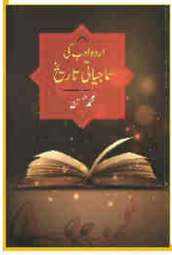


مصنف: محمد حسن

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 334

قیمت: 160 روپے

## آج کے عالمی تناظر میں اردو کا تحفظ اور فروغ

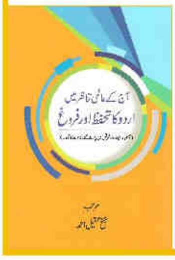


مرتب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 467

قیمت: 240 روپے

## گرونانک: حیات و خدمات

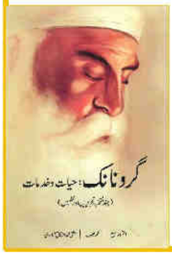


مرتبین: اختر الواسع، محمد حبیب

مفتی محمد مشتاق تجاروی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190، قیمت: 110 روپے

## دربارِ اکبری

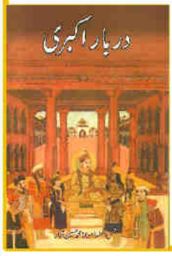


مصنف: شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد

تیسری طباعت: 2020

صفحات: 1070

قیمت: 475 روپے

## راسخ عظیم آبادی: کلاسیکیت، شعریت اور انفرادیت

مصنف: ثاقب فریدی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 422

قیمت: 200 روپے

## حیاتیاتی تنوع اور ماحولیات کے مسائل

مصنف/مترجم: حافظ شائق احمد یحییٰ

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 132

قیمت: 90 روپے


شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly January 2021, Vol.5, Issue:1
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025